رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی عنونا آشنا ہے قید صبح و شام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پرتو بھی ہے

اقبال کی شاعری کا یہ دور، سیاست ملی کے دور جدید کا نقیب ثابت ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں آگ لگ گئی فرنگی استعمار نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ وفاداری، نیازمندی اور وضع احتیاط ترک کرکے، اب وہ میدان عمل میں آنے کے لیے مضطراور بے قرار نظر آنے لگے۔

طرابلس کی جنگ ابھی جاری تھی کہ چرخ نادرہ کار نے ایک اور گل کھلایا،!

بلقان کے خلاف مغرب کی سازش

اکتوبر ۱۹۱۲ء میں، انگلستان، فرانس اور دوسری مغربی حکومتوں نے حسب معمول ریاست ہائے بلقان میں ترکوں کے خلاف ایک آگ لگادی۔

بلقان ترکی حکومت کے ممالک محروسہ میں شامل تھا۔ بلقان کی ریاستیں اگرچہ غیر مسلم تھیں اور وہاں کی آبادی کی غیر معمولی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن ترکوں کے زیر سایہ آجانے کے بعد بلقان کو ایک نئی زندگی مل گئی، یہ ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں، ان کی رعایا کے خون سے ہولی کھیلتی رہتی تھیں۔ انھوں نے عوام کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ امن وامان رخصت ہوچکا تھا، افراتفری کا عالم تھا۔ ترکوں نے اپنے عہد حکومت میں بلقان کو امن دیا۔ عافیت دی، سادات

اتنا مفید نہیں ہے جتنا اس کے جوش عمل کو اپنانا اور اس سے فائدہ اٹھانا، کانگریس اور ہندو خواص کے علاوہ انگریز سامراج نے بھی مسلمانوں کی اس بیداری، جوش اور جذبے کو دیکھ کر سوچا کہ ابھی اور فوراً اگر مسلمانوں کو دبایا گیا تو اس کے نتائج ہولناک ہوں گے، اور اصل مقصد یعنی ترکوں کا خاتمہ دور جا پڑے گا۔ لہٰذا اس نے غیر جانبداری کا ڈھونگ رچائے رکھا۔

مسلح ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے کوئی بحث نہیں، نہ اس بات پر غور کرنے کا ان کے پاس وقت تھا۔ کہ ان کے بارے میں انگریز کیا سوچتے ہیں۔ اور ہندو کیا خیال کرتے ہیں؟ وہ صرف یہ سوچ رہے تھے کہ اس نازک ترین گھڑی میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں کی بیداری میں مسلم صحافت کا حصّہ

اس حقیقت سے انکار کرنا، حقائق سے انکار کرنا ہوگا کہ یہ بیداری تمام تر کامریڈ، الہلال اور زمیندار کی پیدا کی ہوئی تھی۔

کامریڈ اور ہمدرد پر حکومت نے کئی مرتبہ اوچھے وار کیے۔ ضمانتیں طلب کیں اور ضبط کر لیں۔ پریس بند کر دیا، یہی الہلال کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کی زبان بندی کی بھی صدق دل سے کوشش کی گئی۔ اور پے بہ پے اس پر وار کیے گئے، ضمانت طلبی، ضمانت کی ضبطی، تلاشی، سنسر نہ جانے کیا کیا۔؟ مگر۔

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

زمیندار نے بھی، جس جرأت، ہمت اور پامردی کے ساتھ، حکومت کی دراز دستیوں، شرارتوں اور جور پرستیوں کا مقابلہ کیا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حق کی آواز بلند کرنے میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ خطرے کی پروا کی نہ بھبھک

کا اظہار کیا۔ یہ بیداری تمام تر محمد علی کے کامریڈ اور ہمدرد، ابوالکلام کے الہلال اور ظفر علی خان کے زمیندار کی پیدا کی ہوئی تھی جس زمانے میں اردو اخبارات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت پانچ سو ہوا کرتی تھی، اس زمانے میں ان اخبارات کی اشاعت پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان اخبارات کے بعد اس بیداری میں اقبال کی نوا سنجیوں، شبلی کی غزل سرائیوں اور ظفر علی خاں کی شعلہ بار نظموں کا بھی بڑا حصہ ہے۔

یہ باب پھر ناکافی ثابت ہوا، مزید تفصیل اگلے باب میں پیش کی جائے گی۔

ملّی بیداری میں اقبال کی شاعری کا حصّہ

گزشتہ باب میں اقبال کی شعلہ نوائی اور سوختہ سامانی کے بارے میں کچھ مواد پیش کر چکا ہوں۔ لیکن وہ کافی نہ تھا۔ اس باب میں ذرا تفصیل سے اقبال کے اس کارنامے کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں، جو اس نے اپنی قوم کے اندر شعورِ ملّی و دینی پیدا کرنے کے سلسلے میں انجام دیا ہے۔

متحدہ ہندوستان کی بیداری میں بالعموم اور متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری میں بالخصوص، محمد علی، ابوالکلام آزاد اور اقبال کا جو غیر فانی حصّہ ہے وہ اختلافِ فکر و نظر کے باوجود کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال کی شاعری کا ابتدائی دَور

اقبال کا سب سے پہلا شعری مجموعہ جو انہی کا ترتیب دیا ہوا، اور انہی کے اہتمام و انصرام سے شائع ہوا ہے "بانگ درا ہے!" اس میں انھوں نے اپنے کلام کی ترتیب زمانی اعتبار سے رکھی ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا آغاز نہ حمد سے ہوا ہے نہ نعت سے نہ منقبت سے، اس کی پہلی نظم کا عنوان ہے "ہمالہ"

گویا اقبال کی شاعری کا آغاز خالص وطنیت پرستی کے ماتحت ہوتا ہے، پوری

نظم مرصع ہے اور عظمت وطن پر اس طرح نواسنجی کی گئی ہے کہ جواہر لال بھی اگر شاعر ہوتے تو اس سے اچھا نہیں کہہ سکتے تھے۔ ہمالہ کی رفعت اور شان میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

اور اس کے بعد اسی سلسلۂ سخن میں ہمالہ سے نکلی ہوئی ندیوں کو تسنیم و کوثر سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ جوش بیان اور لطف زبان قابل داد ہے۔

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

ہندو مسلم اختلافات کو، اقبال ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں دیکھتے ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، وہ فرقہ آرائی اور قومی انفرادیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ جو شخص ہندوستان میں پیدا ہوا ہے اسے سب کچھ بھول کر پہلے سچا اور خالص ہندوستانی بن جانا چاہیے اس کے بعد چاہے وہ مسلمان بنے یا ہندو یا سکھ یا عیسائی، یہ نقطۂ نظر رکھنے والا شخص، جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاد اور حقوق کی جنگ دیکھتا ہے تو لرز اٹھتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے اور آب گنگا کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے!
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے، بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

اور پھر نعرہ لگاتے ہیں :۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

لیکن اس انتباہ اور پیش گوئی کو کافی نہیں سمجھتے وہ کلام شاعر کی قوت سے واقف ہیں۔ اور اس قوت کو استعمال کرنا بھی جانتے ہیں، اور اسے استعمال کرنے کا تہیہ بھی کر چکے ہیں۔ ذرا انداز سخن دیکھیے :۔

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

اور اے میرے پیارے وطن :۔

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

وہ کام جو واعظ نہ کر سکا، پنڈت نہ کر سکا، برہمن نہ کر سکا، کوئی طاقت نہ کر سکی، شاعر کرے گا، اور کر گزرے گا :۔

پروتا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو!
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

نصیحت کی ضرورت نہیں مشورے کی حاجت نہیں صلاح و مشورہ بے کار اور قطعاً بے کار ہے:

مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا!
دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا!

اور پھر زیادہ مایوس، دل برداشتہ اور مغموم ہوکر، سراپا "صدائے درد" بن کر کہتے ہیں :-

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

ایک اور بڑی معرکہ آرا اور طویل نظم "تصویر درد" کے عنوان سے نظر آتی ہے اس میں بھی وطن، ہندوستان کا ماتم ہے۔ اس کے حالِ زار پر اشک باری ہے۔ اس کی تباہی و بربادی پر نوحہ خوانی ہے۔ اس کے باشندوں کی بے حسی اور تغافل کا رونا ہے۔ وہ اپنی طرح ہر شخص کو بے ریا، خالص اور غیر مشروط محب وطن دیکھنا چاہتے ہیں اور جب یہ چیز نظر نہیں آتی، تو نوحہ وشیون شروع کر دیتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وہ یارونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا!
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

اور پھر اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

اب مخاطب کا لہجہ اور زیادہ تیکھا ہو جاتا ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اقبال کو ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں، کوئی تعلق نہیں، ان کی نظر صرف حال پر ہے۔

بار بار جو غم شاعر کے سینے کو برماتا اور تڑپاتا ہے، وہ وطن کی دو بڑی قوموں کا تعصب یعنی فرقہ آرائی ہے، وہ چاہتا ہے کہ یک رنگ اور ایک بن کر رہیں اور یہاں یہ حالت ہے کہ ہر ایک اپنے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں، چنانچہ شاعر وعظ کی عبا پہن کر گویا ہوتا ہے :-

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروح الفت، فکر درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

وطن کی غلامی، برادرانِ وطن کی بے مہری اور بے پروائی، ساحر فرنگ کی آقایانہ ترک تازی، بے نوایانِ وطن کی مجبوری اور بے بسی، یہی چیزیں تو ہیں جو شاعر کی چشم تماشا کو مصروفِ گریہ رکھتی ہیں، وہ کہتا ہے، ان حالات میں رونے کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے :

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

غلامی کی بے بسی کا کتنا جگر فگار، مرقع شاعر نے کھینچا ہے :

بنا ئیں کیا سمجھ کر شاخ گل پہ آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اہل وطن کو آزادی و غلامی کا گُر بتاتے ہیں :-

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا!

دین و مذہب اور قوم و ملّت، اور جماعت و فرقے کی تفریق و تقسیم شاعر کو پسند نہیں وہ تو بس آدمیت اور انسانیت کی وحدت کا داعی ہے۔

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

کسی صورت میں اور کسی قیمت پر "تمیزِ ملّت و آئین" کو شاعر نہ صرف اپنانے پر تیار نہیں ہے، بلکہ اسے برداشت کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہے، وہ "محبت" کا درس دیتا ہے، محبت، جو ہر قسم کے امتیاز اور تفرقے سے بالا اور ماورا ہے، ذرا اندازِ بیان کی سحر طرازی ملاحظہ ہو:-

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی، چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے
مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

نئے نئے پیرایوں، تشبیہوں، استعاروں اور نکتوں سے کام لے کر شاعر اپنا مفہوم ذہن نشین کر دینے پر تلا ہوا ہے۔

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے
وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بے ستوں بھی کوہ کن بھی ہے

اور ——

اجاڑا ہے تمیز ملّت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

اقبال اگر اپنے اس رنگ پر قائم رہتے، تو کوئی شبہ نہیں کہ ہندوؤں کی مسلمہ تنگ نظری، اور تعصب کے باوجود وہ ہندوستان کے قومی شاعر بن جاتے۔ اور ٹیگور سے عظمت و جلالت میں بڑھ جاتے، اس لیے کہ ٹیگور کی شاعری بنگالی زبان، یا اس کے انگریزی ترجمے تک محدود تھی، اور اقبال کی شاعری، ملک کی متحدہ عوامی زبان کے وسیلے سے ہر ہندوستانی کے دل سے براہ راست ٹکراتی تھی۔

اقبال کے خیالات میں تبدیلی کا پس منظر

تجربہ، مشاہدہ اور مطالعہ انسان کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ اقبال کی وطن پرورانہ شاعری کا دور ۱۹۰۵ء تک ہے۔ اس کے بعد وہ یورپ چلے گئے!

یورپ میں اقبال نے بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ سیکھا، اور بہت کچھ پایا، اور بہت کچھ حاصل کیا!۔

یورپ کے دورانِ قیام میں اقبال نے وطنیت کے اس بھیانک روپ کو دیکھا جس سے ان کی روح کانپ اٹھی۔ یہیں کے دورانِ قیام میں، انھیں اسلامیات کے مطالعے، اور تاریخ اسلام سے استفادے کا موقع ملا، یہیں رہ کر انھیں ہندو سامراج کو علمی، تاریخی اور عملی حیثیت سے جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ تو وہ حال اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر ماضی کی طرف لپکے، اور یہاں ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ انھیں وہ سب کچھ مل گیا۔ جسے پانے اور حاصل کرنے کے لیے ان کی روح بے قرار تھی۔ انھوں نے وہ سب کچھ پالیا، جس کے حصول کی آرزو میں ان کی روح تڑپ رہی تھی۔

لیکن جسے وہ محسوس نہیں کر رہے تھے، جسے بیان کرنے کے لیے ان کی کارگاہ فطرت میں الفاظ نہیں ڈھلے تھے۔

لیکن دفعتاً حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے، مگر یہاں آکر انھوں نے کیا دیکھا؟

جس دین، جس مذہب، جس قوم، اور جس ملت کی محبت اپنے ساتھ لے کر دیار فرنگ سے واپس آئے تھے، وہ نشانۂ ستم بنی نظر آئی تھی، اسی سال ایران ایک سخت ترین گرداب سے دوچار ہوا۔ ایک طرف روس تھا۔ دوسری طرف برطانیہ اعظمیٰ۔ ایران ان میں سے کسی ایک کی قوت و طاقت کا حریف بننے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ نہ کہ ان دونوں سے عہدہ برآ ہو سکتا، ان دونوں کی طرف سے ظلم ہو رہا تھا اور وہ ظلم سہہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، ایران ایک آزاد اور خود مختار مملکت نہیں ہندوستان کی کوئی معمولی سی ریاست ہے۔ جہاں روس اور برطانیہ کے ریزیڈنٹ کو مکمل آمرانہ اختیارات، اندرونی معاملات میں مداخلت کے حاصل تھے۔ شاہ قاچار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا یورپ کی سیاحت کرکے زخم دل پر مرہم رکھیں یا وطن میں رہ کر بے آبرو ہوتے رہیں۔

۱۹۰۹ء میں، سلطان عبدالحمید خاں کو آخری دستوری حکومت پر راضی ہو جانا پڑا۔ اور رخت سفر بھی باندھنا پڑا۔ انور بے اور کئی دوسری شخصیتیں ابھریں اور انھوں نے یورپ کے مرد بیمار یعنی ترکیہ کو سنبھالنے کی کوششیں کیں لیکن رخنہ اندازیوں کا مقابلہ کرنا ان کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس الغرب پر، جو اب لیبیا کہلاتا ہے، اٹلی نے پوری فرعونیت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ شیخ سنوسی نے مدافعت کی، لیکن وہ اتنی بڑی قوت کا مقابلہ کس طرح کر سکتے تھے۔ ترکوں کی اس طرح ناکہ بندی کی جا چکی تھی کہ وہ طرابلس کی کسی طرح بھی مدد

نہیں کر سکتے تھے، اسی جنگ میں ایک عرب لڑکی مجاہدوں کو پانی پلاتی ہوئی خود جام شہادت نوش کر کے عالم جاودانی میں پہنچ گئی تھی۔ جس پر ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا تھا کہ فاطمہ بنت عبداللہ قبیلہ البراعصہ کے سردار شیخ عبداللہ کی لڑکی تھی، تعداد اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے یہ قبیلہ بہت بڑا تھا۔ عرب مجاہدوں کو ترکیہ کے سرکاری خزانے سے کچھ رقم ملا کرتی ہے۔ لیکن شیخ نے اس رقم کے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا، اس لیے کہ وہ صرف خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے، مالی منفعت ان کے پیش نظر نہ تھی۔

اس پورے خاندان نے مرتبہ شہادت حاصل کیا جس میں خواتین بھی شامل تھیں ڈاکٹر اسماعیل شباتی بے نے، فاطمہ کے بارے میں جو تاثرات شائع کرائے۔ ان کی رو سے فاطمہ کی عمر صرف ۱۴ سال کی تھی۔ وہ اپنا چھوٹا سا مشکیزہ کندھے پہ اٹھائے پیاسوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ لیکن وہ کبھی کسی خطرے سے ہراساں نہیں ہوئی۔ جون ۱۹۱۲ء میں بارہ ہزار اطالوی سپاہیوں نے زوارہ کے مقام پر حملہ کیا۔ مقابلے میں جو عرب اور ترک تھے، ان کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ لڑائی عصر کے وقت تک جاری رہی، آخر اطالوی بارہ سو لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

فاطمہ کی شہادت سے متعلق ڈاکٹر اسماعیل بے کا بیان ہے کہ اطالوی توپوں سے آگ برس رہی تھی۔ میں نے ظہر کے وقت فاطمہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ دھوپ اور تپش سے جھلسا ہوا تھا۔ بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہ جمی ہوئی تھی۔ عصر کے وقت عرب مجاہدوں کا ایک دستہ اطالویوں پر ٹوٹ پڑا۔ احمد نوری بے، ایک ترک افسر بھی اپنے تیس سپاہیوں کے ساتھ شریک کارزار تھا۔ راستے میں ایک اطالوی جیش سے مڈبھیڑ ہوئی جو گھات میں چھپا بیٹھا تھا۔ فاطمہ احمد نوری بے کے دستے کے ساتھ تھی، اطالویوں

نے اسے نرغے میں لے لیا۔ آخر ترکوں کے جوشِ شجاعت نے راستہ پیدا کر لیا۔ لیکن چار سپاہی زخمی ہو کر گر گئے۔ فاطمہ نے دوڑ کر اپنا مشکیزہ ایک زخمی ترک کے سینے پر رکھ دیا، چاہتی تھی کہ مشکیزے کا منہ زخمی کے لبوں سے لگا دے کہ ایک اطالوی سپاہی نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اپنے آپ کو بے قابو پا کر بجلی کی سی سرعت سے زخمی ترک کی تلوار اس نے اٹھائی اور ایسا وار کیا کہ اطالوی سپاہی کا پنجا کٹ کر لٹک گیا۔ فاطمہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اطالوی نے پیچھے ہٹ کر بندوق اٹھائی اور اس معصوم مجاہدہ کو چشم زدن میں شہید کر ڈالا۔ جنگ کے بعد عرب اور ترک اپنے زخمیوں کی تلاش میں نکلے تو اس مقام پر چار بہادر ترک بے ہوش پڑے تھے قریب ہی فاطمہ کی نعشِ بے کفن بھی، اس کا مشکیزہ ترک غازی کے سینے پر پڑا تھا مشکیزے کا منہ لبوں پر نہ تھا جس سے پتا چلا کہ فاطمہ زخمی ترک کو پانی پلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ فاطمہ کی شہادت پر اقبال نے جو اثر انگیز اور غیر فانی نظم لکھی تھی۔ اس کا ذکر گزشتہ باب میں ہم کر چکے ہیں۔ اطالیہ کی اخلاقی اور مادی تائید برطانیہ بھی کر رہا تھا شیخ سنوسی اپنے تقدس اور ترک اپنی شجاعت کے باوجود، اس یلغار کو نہ روک سکے۔

۱۹۱۲ء میں ریاست ہائے بلقان نے برطانیہ کی شہ پا کر ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور انھیں نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور

یہ سب چیزیں اقبال کے سامنے تھیں۔ اور انھیں دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے اور کچھ اس طرح تڑپے کہ ان کی زندگی کا رُخ بدل گیا۔ جو شاعر وطنیت کا داعی تھا، وہ اسلام کا واعظ شیریں مقال بن گیا۔ اقبال کی نظموں نے اس دور میں وہ کام کیا جو صورِ اسرافیل سے ممکن ہے۔ اس نے مغرب کے خلاف، جس سے مرعوبیت عام تھی، ایک مورچہ قائم کیا، اس نے وطنیت کے خلاف جس کی پرستش ہو رہی تھی ایک محاذ قائم کیا، اس نے

لادینیت اور دہریت کے خلاف جو فیشن میں داخل ہوگئی تھی، محمدؐ کی داستان، علی کی کہانی، اور حسین کا قصہ کچھ اس انداز میں سنایا کہ لادینیت اور دہریت کا رنگ زرد ہوگیا اور اسلام کے آئینے پر صیقل ہوگئی، جو اسلام کے نام سے شرماتے تھے، وہ اسلام پر فخر کرنے لگے، جو دین و مذہب کو راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے وہی دین کا پرچم لے کر میدان میں اتر آئے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ معجزہ صرف اقبال کا تھا، اس میں کچھ اور عناصر بھی شریک تھے لیکن اقبال کی شخصیت اس درجہ چھائی ہوئی تھی کہ اسے نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ فراموش کرنا ممکن ہے۔

اس دور میں اقبال نے جو اثر انگیز، ولولہ آفرین اور روح پرور پیام دیا وہ ہر مسلمان کے دل کی آواز بن گیا۔ اس عہد کے ان کے شاعرانہ فتوحات بہت ہیں لیکن ہم صرف چند کی طرف اشارہ کریں گے۔

یورپ کے طویل قیام کے بعد جب اقبال وطن واپس آئے تو ان کا دل ولولوں سے معمور تھا، وہ اپنی قوم، اپنی ملت اور اپنے دین کے لیے، اپنے فکر و ذہن کی ساری صلاحیتیں وقف کر دینا چاہتے تھے، اپنے ایک دوست کو دعوت عمل دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اُٹھ کہ پیدا ہوئی ظلمت افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں!
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

اور وطنیت کے بت کدے سے اٹھ کر، اسلامیت کے بحر ناپیدا کنار میں گم

ہو جانے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں :۔

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رُخِ سعدیٰ و سلمیٰ کر دیں !
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار !
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

اور ——————

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اس دعوت کا اثر دوست پر تو اتنا ہی ہوا کہ وہ صوبے کے وزیر، پھر ہائی کورٹ کے جج، بعد ازاں انڈیا کونسل کے ممبر بن گئے، لیکن اقبال اپنے اس پیام پر زندگی کے آخری سانس تک عامل رہے، یعنی خود جلتے رہے اور دیدۂ اغیار کو بینا کرتے رہے۔

اس کے بعد اقبال نے وہ معرکہ آرا نظم کہی تھی جو "عقلیہ" کے عنوان سے بانگِ درا میں موجود ہے، اور جس پر گزشتہ باب میں ہم گفتگو کر چکے ہیں ۔

اب اقبال کی زبان پر، عرب، حجاز، یثرب اور بطحا کے ترانے تھے، وہ غزلیں کم کہتے تھے، لیکن غزلوں میں بھی یہی رنگ غالب تھا، مارچ ۱۹۰۷ء میں ان کی جو غزل مخزن میں شائع ہوئی تھی، وہ اسی حقیقت کی غماز ہے۔ ایک طویل غزل میں، جو نظم کی معنویت اپنے اندر پوری سحر طرازی کے ساتھ رکھتی ہے ارشاد فرماتے ہیں :۔

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اور اس طرح ایک ولولہ پیدا کر چکنے کے بعد، مغربی سامراج کی طرف رُخ کرتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیاں بنے گا ناپائیدار ہوگا

کس عزم، کس تیور، اور کس بانکپن کے ساتھ پیش گوئی کرتے ہیں:۔

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا!
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا
یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

اپنے آپ سے، اپنے پیام سے، اپنی دعوت سے ذرا بھی مایوس نہیں ہیں، خود اعتمادی پورے طور پر موجود ہے، کہتے ہیں اور کس جوش سے کہتے ہیں:۔

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررِ فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اور واقعی اس دیوانے شاعر کی آہ شرر فشاں، اور نفس شعلہ بار نے ملت کی قسمت بدل دی

اقبال کو جس طرح اپنے ماضی پر فخر ہے۔ اسی طرح اپنے اکابر کے ان تعمیری کارناموں پر بھی فخر ہے جو انھوں نے دنیا کے مختلف خطوں میں سرانجام دیے تھے۔ یہ مسلمان جس ملک اور جس دنیا میں گئے۔ اپنے ساتھ، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنا تمدن اور اپنا جاہ و جلال بھی ساتھ لیتے گئے، جس کے آثار و نقوش اب تک موجود ہیں۔ اور شاید عرصۂ دراز تک موجود رہیں گے۔ اقبال ان آثار و نقوش کو دیکھتے ہیں اور ان کے سامنے ماضی کی پوری تاریخ آجاتی ہے اور حال سے ماضی کا موازنہ کر کے وہ خون کے آنسو رونے لگتے

ہیں۔ لیکن تنہا نہیں، ان کا رونا متعدی ہے، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء کے بعد کا اقبال کا جو کلام ہے، اس میں سب سے پہلا نمبر بلاد اسلامیہ کا ہے دلی کے نشان عظمت وحشمت کو دیکھ کر فرماتے ہیں اور کتنی صحیح بات فرماتے ہیں :۔

سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاج دار
نظم عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

اور پھر دلی کے ساتھ ہی، انھیں ہارون اور مامون کا بغداد یاد آجاتا ہے، جس نے قیصر روم کے چھکے چھڑا دیئے تھے اور دنیائے اسلام کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔

یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے ساماں ناز
لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ مجاز
جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما ان کا مدفن ہے یہی

یہ صرف شاعری نہیں ہے، صحیح اور مستند تاریخ بھی ہے۔

بغداد سے شاعر کی نظر، اندلس کے عروس البلاد قرطبہ پہنچ جاتی ہے۔ ابھی تک اقبال نے قرطبہ کی زیارت نہیں کی ہے۔ زیارت کی نوبت تو کہیں بیس سال بعد آئی۔ مگر باایں ہمہ وہ جانتے ہیں قرطبہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے تہذیب وتمدن اور علم و فن کے اعتبار سے کہاں تک پہنچا دیا تھا۔ اور گو آج مسلمان وہاں نہیں ہیں، لیکن ان کے وہ آثار ونقوش جنھیں صدیوں سے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اب تک موجود ہیں۔

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور،

قرطبہ اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاک گلشن یورپ کی رگ نمناک ہے

قرطبہ کے بارے میں اقبال نے جو کچھ کہا ہے۔ یہ افسانہ طرازی نہیں امر واقعہ ہے اس شہر کو عربوں نے ۷۱۱ء میں اندلس پر تسلط کے بعد پایۂ تخت بنالیا۔ ۱۲۳۶ء تک یہ شہر ہر اعتبار سے یکتا اور منفرد رہا۔ اس کی آبادی دریائے کبیر کے دونوں جانب ۲۴ میل کی لمبائی میں پھیل گئی تھی۔ خود یورپین مورخوں کا بیان ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں صفائی، عمارتوں کی خوبی و رعنائی، درس گاہوں کی کثرت اور فراوانی کے لحاظ سے یہ یورپ کا بہترین شہر تھا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کے عیسائی طلبہ یہاں کی تعلیم گاہوں میں علوم و فنون کی تعلیم و تکمیل کے بعد اپنے دیس واپس جاتے تھے، یورپ کے اندر علوم و فنون کی جو چمک دمک دکھائی دے رہی ہے۔ وہ یہیں سے مستعار لی گئی تھی۔ قرطبہ کے مسلمان علماء، حکماء اور ماہرین سائنس کے تذکروں سے انسائیکلوپیڈیا، اور تاریخوں کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ عیسائیوں نے اس ملک کو فتح کر لینے کے بعد، مسلمانوں کی ہر چیز فنا کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ عمارتیں ڈھا دیں۔ گھر اجاڑ دیے، کتب خانے جلا دیئے۔ تعلیم گاہوں کے دروازوں پر تالا لگا دیا۔ لیکن آج وہ اس حقیقت کے معترف ہیں کہ قرطبہ ہی کے واسطے سے علوم کی روشنی یورپ تک پہنچی۔ اور وہاں سے جہالت کا اندھیرا دور ہوا۔ بیروت کے یگانہ فاضل کرد علی نے اندلس کے ماضی و حال پر ایک معرکہ آرا کتاب لکھی ہے۔ جس میں قرطبہ کی علمی اور تہذیبی سربلندیوں کا ذکر تفصیل سے ذکر ہے۔

قرطبہ کے بعد، اقبال کی نظر قسطنطنیہ (استنبول) پر جاتی ہے۔ روم کے فرماں روا قسطنطین اعظم نے اسے اپنے نام سے منسوب کیا، اور روم کے بجائے یہیں کی اقامت

اختیار کرلی۔ بعد ازاں رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک کا مرکز روم، دوسرے کا قسطنطنیہ قرار پایا۔ تاریخ کے اوراق میں یہی حکومتیں "مغربی رومی حکومت" اور "مشرقی رومی حکومت" کے نام سے مشہور ہیں۔

اس شہر پر مسلمانوں نے سب سے پہلے ۴۸ھ مطابق ۶۷۰ء میں حملہ کیا۔ حضرت ابوایوب انصاری، صحابیٔ رسولؐ اسی معرکہ آرائی میں شہید ہوئے تھے، جن کی تربت اب تک وہاں موجود ہے۔ اس کے بعد شہر پر کئی بار حملہ آور ہوئے آخری مرتبہ سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں اس پر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔ استنبول نام اسی نے رکھا تھا، اقبال سلطان محمد فاتح کے اس کارنامے سے اس درجہ متاثر ہیں۔ کہ اسے "مہدی" قرار دیتے ہیں۔ اس نظم پر، مخزن (اپریل ۱۹۰۹ء) میں جو نوٹ انھوں نے لکھا تھا، اس میں یہ تصریح کی تھی۔

اس پس منظر میں اب ملاحظہ فرمایئے۔ اقبال قسطنطنیہ (استنبول) کے بارے میں کس درد و سوز کے ساتھ نغمہ سرا ہوتے ہیں، اور اپنی نغمہ سرائی میں پوری تاریخ بیان کر جاتے ہیں:۔

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدی امت کی سطوت کا نشان پائیدار
صورت خاک حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستان مسند آرائے شہ لولاک ہے
نکہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربت ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلمان ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کے کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

دلّی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے "شہِ عرب و عجم" کے دیار، یعنی مدینہ منورہ میں پہنچتے ہیں اور بجا طور پر ان کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ:۔

"اگر اسلامی قومیت کے لیے کسی مقام کا پابند ہونا جائز ہوتا تو اس کی بنیاد نہ ہندوستان بن سکتا ہے نہ ایران، نہ شام، بلکہ صرف مدینہ منورہ!"

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ گو اسلام کی قومیت کسی سرزمین کی پابند نہیں ہو سکتی، اسے کسی خاص خطّے تک مرکوز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اسلامی قومیت کی بنیاد نژاد و بوم، وطن اور سرزمین پر نہیں ہے، بلکہ فکر اور عقیدے پر ہے، اس معبد میں ہر رنگ، ہر ملک اور ہر سرزمین کا باشندہ یکساں اور ساوہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے لیکن بہ فرض محال اس قومیت کے لیے کسی سرزمین کی ضرورت واقعی ہو تو وہ مدینہ منورہ کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی، ذرا سوچیے تو سہی "خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" کا ترانہ سنج، اب کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔

مدینے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:۔

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰ[۴۱]
دید ہے کعبے کو تیری حجِّ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

کتنی درست ہے اور سچی بات کہی ہے:۔

نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے

اور یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اسلامی قومیت کے گہوارے سے متعلق فرماتے ہیں

ہے اگر قومیت اسلام پا بند مقام
ہند ہی بنیاد اس کی ہے نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو، ماویٰ ہے تو
نقطہ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

آخری شعر میں جو کچھ کہا ہے، اس کے الفاظ میں جو تاثیر اور کیفیت ہے۔ اس کی تشریح الفاظ کے ذریعے نہیں کی جا سکتی یہ صرف اقبال کی آواز نہیں، ہر قلب مسلمان کی آواز ہے

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے۔ تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

شعور ملی کی تخلیق و تجدید کے سلسلے میں اقبال کی شاعری نے جو نمایاں حصّہ لیا ہے، کتنے ہی اختصار سے یہ داستان بیان کی جائے۔ مگر اسے اس قدر جلد سمیٹا نہیں جا سکتا اس کی وضاحت اور تعارف کے لیے کم از کم ایک باب اور درکار ہے!

اقبال کی شاعری کا پیام

(۳)

شمع اور شاعر کے مکالمات و مباحث جاری ہیں، شاعر کو ایک سوال کرکے شمع سے دامن چھڑانا مشکل ہوگیا۔ یہ شمع کا ہے کو حکیم دوراں ہے۔ کیا ہے جو اس بیاض میں مرقوم نہیں۔؟ شاعر حیران و پریشان اس کی باتیں سن رہا ہے اور سر دھن رہا ہے شمع کا طوفان تکلم جاری ہے اور

ہاں اسی شاخ کہن پر پھر بنالے آشیاں
اہل گلشن کو شہید نغمۂ مستانہ کر

اور پھر ٹیپ کا بند تو یہ ہے :

اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذ گل
یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر

اور شاید شمع کی یہی تلقین تھی جس نے شاعر کو "سراپا نالہ" بنا ڈالا۔

اس کے بعد شمع شاعر کے واسطے سے ملت کے عام فرد کو، کہ اس پر ہر چیز کا انحصار ہے۔ مخاطب کرتی ہے اور بڑے خطیبانہ انداز میں کہتی ہے کہ یہ حالات کی نامساعدت، یہ زمانے کی سختیاں، یہ غیروں کے جور و ستم، یہ حاکموں کی چیرہ دستیاں،

یہ اکثریت کی ہولناکیاں ۔ اور یہ حکومت مسلّط کی خوں آشامیاں تجھے آگے قدم رکھنے کی بجائے پسپا ہونے کی دعوت کیوں دے رہی ہیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے اللہ نے تیرے خالق نے تجھے کیسی قوت اور طاقت ودیعت کر دی ہے ؟

آشنا اپنی حقیقت سے ہو، اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

قدم بڑھانے میں آخر یہ تذبذب اور ہچکچاہٹ کیوں ہے ۔ ؟ تو کسے تلاش کر رہا ہے ؟

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے ؟
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفان سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اور یہ سب کچھ دل نشیں کر چکنے کے بعد شمع، کس زور شور اور جوش کے ساتھ دعوت دیتی ہے ۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
قوتِ باطل ہے کیا، غارت گرِ باطل بھی تو

لیکن اتنا کہہ کر بھی تسلّی نہیں ہوتی، ایک اور بات بھی جو حاصلِ سخن کا درجہ رکھتی ہے بتانی ہے۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے،
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ایک مرتبہ یہ بات پھر ذہن میں تازہ کرلیں کہ یہ نظم ۱۹۱۳ء میں کہی گئی ہے جب ہندوستان کے مسلمان فرنگی استبداد کا شکار تھے، اور عالم اسلام بھی آقایان فرنگ کی تحویل میں تھا، ہر شام شب غم کی پیامبر ہوتی تھی، اور ہر سحر صبح الم کی ترجمان، استبداد قہرمانیت اور جور وظلم کی چکی میں مسلمان پیسے جارہے تھے، وہ ہراساں تھے، خوفزدہ تھے سراسیمہ تھے، اور ٹھیک ان حالات میں یہ گوشہ گیر اور سیاست ناآشنا شاعر اپنی قوم کو ایک انقلاب عظیم کی دعوت دے رہا ہے، یہ انقلاب جو غماز ہے بغاوت کا، بغاوت باطل کے خلاف، قوت مسلّط کے خلاف، انداز بیان گو رمزیہ ہے لیکن الفاظ اتنے تپتے ہوئے ہیں کہ شعلہ اور انگارہ نظر آرہے ہیں، رمز، روپوش ہوجاتا ہے اور حقیقت عیاں ہوجاتی ہے۔

شمع کی تلقین وتذکیر کا سلسلہ جاری ہے، جو کچھ اس نے اب تک کہا ہے، اس سے وہ مطمئن نہیں ہے، وہ مخاطب کے سینے میں انگیٹھی سلگا دینا چاہتی ہے، اس کے دل میں مرمٹنے کی تڑپ پیدا کردینا چاہتی ہے۔ وہ اسے یہ سبق دینا چاہتی ہے کہ تو مسلمان بن کر زندہ رہ ورنہ مرجا!! اس سے بڑی دعوت اور کیا ہوسکتی ہے، اس دعوت میں عزیمت اور استقامت کی جلوہ آرائیاں موجود ہیں، اس دعوت میں اسلامیت کی صحیح روح تڑپتی ہوئی نظر آرہی ہے، یہ دعوت بھی ہے، نفیر بھی اور تکبیر بھی!

چنانچہ اسی تکبیر کی گونج میں شمع کہتی ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

اور جب یہ صورت ہے کہ قطرۂ ناچیز ہونے کے باوجود تجھ میں سمندر کا خروش بھی موجود ہے تو پھر احساس کمتری کیسا اور کیوں؟

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

اور یہ شوکت طوفاں تیرے اندر اس لیے مخفی اور غیر محسوس طور پر موجود ہے کہ:

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا!
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

اور اس پیامِ ناز ہی نے تجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ:

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک جس پر ہے شاہد کوہ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

اپنے اس سامان سے، اپنی اس قوت سے، اپنی اس قوتِ تسخیر سے فائدہ اٹھانے کے بجائے تو، ولولے سے محروم، اور کھلونوں پر قانع کیوں ہو گیا ہے، ورنہ یاد رکھ۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اس طرح خوب جھنجھوڑ کر، رک کر اور آمادہ عمل کرنے کے بعد شمع بشارت دیتی ہے:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
دیکھ تو لے سطوت رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

نالہ صیاد سے ہوں گے نوا سنج طیور
خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

اس بشارت کے بعد بھی دل مطمئن نہیں ہوتا لہٰذا کہنا پڑتا ہے :

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

لیکن وضع احتیاط کے باوجود آنکھ سے جو دیکھا تھا وہ بالآخر زبان پر آ ہی گیا ۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

"شکوہ" اگر جنگ طرابلس کا تحفہ تھا تو "جواب شکوہ" محاربہ بلقان کا تحفہ تھا۔

یہ نظم ۱۹۱۳ء کے ایک جلسۂ عام میں جو موچی دروازے کے باہر منعقد ہوا تھا۔ اقبال نے پڑھی تھی۔ بڑی تعداد میں اسے چھپوا کر لائے تھے جو نسخہ کیمیائی کی طرح فوراً ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور یہ سب رقم بلقان فنڈ میں دے دی گئی ۔ یہ جلسہ مولانا ظفر علی خاں کے جوش ملی کا آئینہ دار تھا۔ یعنی اس کا اہتمام و انتظام انہی نے کیا تھا۔

"شکوہ" میں شاعر نے، اپنے آپ سے اپنی قوم کی وکالت کرتے ہوئے، راز و نیاز کے پیرائے میں بہت سی باتیں کہ ڈالی تھیں اور مسلمانوں میں ایک ولولہ تازہ پیدا کر دیا تھا۔ "جواب شکوہ" میں خدا کی طرف سے ان مصائب کے نزول کے اسباب بیان کیے ہیں کہ نہ تم ہمیں چھوڑتے، نہ ہم تمھیں فراموش کرتے، اب بھی اگر صراط مستقیم پر گامزن ہو جاؤ سچے مسلمان بن جاؤ تو سب کچھ تمھارا ہے، ورنہ خالی خولی شکوہ بے کار ہے۔ تمھارا حال تو یہ ہے :

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے

طبع آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تم ہی کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں!

اور صرف اتنا ہی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

یہ مسلمان جو آج اسلام کے مدعی ہیں، انھیں درحقیقت اسلام سے کیا تعلق رہ گیا ہے؟ کیا یہ وہی نہیں ہیں جنھوں نے اسلام کا نام تو بے شک اختیار کر رکھا ہے لیکن ان کا کوئی فعل ایسا نہیں جو اسلام کی روح، تعلیم اور تلقین کے خلاف نہ ہو؟ کیا اسی برتے پر ان انعامات کے طالب ہیں جو ان کے اسلاف کو عطا کیے گئے تھے؟ یاد رکھو!

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ:

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمھارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملّتِ بیضا غربا کے دم سے

یوں تو اس قوم میں واعظ بھی ہیں، اور حکیم بھی، عالم بھی، اور فلسفی بھی ہیں مگر

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

آج تم غلام ہو، کبھی تم باطل سے لڑ جاتے تھے۔ اب اس کی غلامی پر فخر کرتے ہو۔ کبھی غیر اللہ کے سامنے تم تلوار تھے، اب سربسجود ہو، کبھی تم حق و صداقت کے علم بردار تھے، عدل و احسان کے پیکر تھے، عفت اور حیا کے جوہر تھے، شجاعت اور شہامت کا نمونہ تھے، مگر اب تمھاری حق گوئی افسانۂ ماضی بن چکی ہے، تمھارے دوسرے اوصاف و صفات بھی قصۂ پارینہ بن چکے ہیں، کیا تمھیں یاد نہیں :-

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمھیں موت کا غم اس کو خدا کا ڈر تھا!

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو!
پھر پسر لائق میراثِ پدر کیوں کر ہو؟

اپنے اسلاف اور آبا و اجداد سے تم کتنے الگ ہو، انھوں نے اسلام کو اپنی روح میں جذب کر لیا تھا، ان کی گفتار، ان کا کردار، ان کی زندگی، ان کے آدابِ حیات، ہر چیز میں اسلام کی روشنی جھلکتی تھی، لیکن تم نے ان تمام باتوں کو یکسر فراموش کر دیا ہے، اب تو حالت یہ ہے کہ:

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم:
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی ان کا تھا سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی

اسلاف و اخلاف کا مزید موازنہ:-

خود کشی شیوہ تمھارا، وہ غیور و خود دار
تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار!
تم تڑپتے ہو کلی کو وہ گلستاں پہ کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

یہ وطن وطن کا شور، یہ حبِ وطن کا نعرہ، یہ زر و بوم کی پرستش، کیا اسلام

نے ان لغویتوں کو جائز رکھا ہے ؟ اسلام تو ہر چیز سے ماورا رہے، وہ تو صرف ایک ہی امتیاز کا قائل ہے اور وہ ہے اسلام، اے مسلمان، اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس حقیقت کو نہ بھول:

پاک ہے گردِ وطن سے سرو داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

ہاں، ایران میں ماتم بپا ہے، بے شک ترکوں پر مصائب کے بادل منڈلا رہے ہیں، لیکن کیا تم نے خیال کر لیا ہے کہ اس طرح اسلام کو کچھ گزند پہنچ سکتا ہے، یا جس طرح لوگ مرتے اور جیتے ہیں اس طرح قومیں بھی زندہ ہوتی، اور فنا ہوتی ہیں، لیکن اسلام۔ ؟ اسلام اس وقت تک قائم ہے جب تک یہ زمین اور آسمان قائم ہیں۔

اس سے پہلے بھی، مسلمان قوموں پر، آفتیں آچکی ہیں، مصائب کا نزول ہو چکا ہے، تباہیاں اور بربادیاں خیمہ زن ہو چکی ہیں، ؟

لیکن کیا اسلام فنا ہو گیا ؟

کیا ان قوموں کے مٹ جانے سے اسلام پر بھی موت طاری ہو گئی ؟

تاریخ کے اوراق تیرے سامنے ہیں، انھیں الٹ اور دیکھ، اور یاد رکھ

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس طرح اس حقیقت کو بھی نہ بھول :

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا !
غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خود داری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

تو اللہ کا آخری پیغام ہے، تو خدا کے آخری دین کا پاسبان ہے، تو خدا کے آخری نبی کا امتی ہے، ان حالات سے دل برداشتہ کیوں ہوتا ہے؟ اٹھ اور

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رختِ بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنگ مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ "محمدؐ" سے اجالا کر دے

اور تجھے جس "اسم" سے دنیا کو روشن کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جانتا بھی ہے یہ ہستی کون ہے ؟

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو تم بھی نہ ہو
بزمِ توحید کی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

یہ نام یہ اسم گرامی، اس کی رفعت، اس کی برکت، اس کی شان، اس کا جلال و جمال کہاں نہیں ہے ؟

دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان "رفعنا لک ذکرک" دیکھے

تو اگر زندہ رہنا چاہتا ہے، ترقی کرنا چاہتا ہے، سربلندیوں کا آرزومند ہے، رفعت اور شان کا جویا ہے تو ہر چیز سے منہ موڑ کر، تجھے "محمدؐ" اور صرف محمدؐ کا ہو رہنا پڑے گا۔ اگر اس امتحان میں تو کامیاب رہا تو پھر کہیں اور کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش، خلافت ہے جہانگیر تری
ما سوا اللہ کے لیے، آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے، تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور عین اس ہنگامہ کارزار بلغار میں ترکوں نے اپنے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت جس طرح دیا اس سے اقبال کے دل کی کلی کھل گئی۔

قسطنطنیہ سے بھی پیشتر یورپین ترکی کے جس شہر کو مسلمانوں نے فتح کیا تھا وہ ادرنہ (ایڈریانوپل) تھا ۱۹۱۳ء میں بلغاریہ سربیا، مانٹی نیگرو، اور یونان کی فوجوں نے متحدہ بلغار اس شہر پر کی۔ جنگ کے موقع پر ہنگامی قوانین کا نفاذ ساری دنیا میں ہوتا ہے، چنانچہ ادرنہ میں بھی ترکی حکومت نے عام شہریوں سے وہ تمام چیزیں حاصل کرنے کا قانون نافذ کر دیا جو فوج کے لیے ضروری تھیں غازی شکری پاشا اس شہر کی حفاظت پر مامور تھے فوج کم، سامان رسد ناپید، لیکن قاضی شہر نے فتویٰ دے دیا کہ (غیر مسلم) کا مال۔ مسلمان فوج ہنگامی قوانین کی آڑ لے کر اپنے تصرف میں نہیں لا سکتی جب تک وہ خود رضا کارانہ طور پر ایسا نہ کریں اس فتوے پر عمل ہوا اور ذمیوں کا مال واپس لوٹا دیا گیا، ۲۵ مارچ ۱۹۱۳ء کو مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دشمن نے آخری بھرپور حملہ کیا یہاں فوج کم تھی رسد بھی نایاب ۲۶ مارچ کو شہر فتح ہو گیا۔ صرف ایک دن میں دشمن کی توپوں نے تیس ہزار پھٹنے والے گولے شہر پر پھینکے تھے شہر فتح کرنے کے بعد غازی شکری پاشا اور دوسرے فوجی قید کر لیے گئے جب یہ قیدی بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ میں لائے گئے۔ تو بڑے بڑے فوجی اور شہری حکام نے پرتپاک استقبال قیدیوں .. کی شجاعت و شہامت سے متاثر ہو کر کیا لیکن دشمن کے قبضے میں زیادہ دنوں تک یہ شہر نہ رہ سکا غازی انور پاشا نے جولائی ۱۹۱۳ء میں اسے دوبارہ فتح کر لیا۔

بہرحال اس واقعے سے اقبال بہت متاثر ہوئے انھیں اس واقعے میں اسلامی روشنی جھلملاتی نظر آئی اور وہ ترنم پر مجبور ہو گئے انھوں نے اس موقع پر

ایک معرکے کی نظم لکھی۔ جس کے چند شعر یہ ہیں ۔

مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام
روئے امید آنکھ سے مستور ہوگیا
آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے
"آئین جنگ" شہر کا دستور ہوگیا
ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل
شاہیں گدائے دانۂ عصفور ہوگیا

ہنگامی اعلان کا نفاذ اگر صرف مسلمان پر ہوتا تو کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی لیکن جن غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت حکومت پر فرض تھی ان کی کوئی چیز ان کی مرضی کے بغیر نہیں لی جاسکتی تھی ۔ چنانچہ ہنگامی حالات کے اعلان سے جب غیر مسلم بھی متاثر ہوئے تو قاضی شہر خاموش نہ رہ سکا ۔

لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سنی یہ بات
گھبرا کے مثل صاعقۂ طور ہوگیا !
ذمی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام !
فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہوگیا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۔

چھوتی نہ تھی یہود و نصارا کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہوگیا

اقبال نے خوب اچھی طرح سوچ کر اور تمام حالات کا جائزہ لے کر جو راہ عمل متعین کی تھی وہ اسلام کی راہ تھی ۔ ان کی ندا اور صدا صرف یہ تھی کہ دنیا کی کسی طاقت سے ہراساں اور دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اسلام سے

اچھی اور محکم سپر کوئی نہیں اگر مسلمان اس سپر پر بھروسہ کریں گے تو کبھی ناکام نہیں ہوں گے اور انھیں کوئی قوم شکست نہیں دے سکے گی۔

لیکن یہ راستہ اختیار کرنے کے کچھ شرائط بھی تھے۔

اور ان شرائط میں سب سے پہلی اور اہم شرط یہ تھی کہ وطنیت کا وہ بت پرستانہ تصور جسے یورپ نے مذہب سے بے تعلقی کے باعث پیدا کیا ہے اور جسے دنیا کی اقوام وملل نے عام طور پر اختیار کر لیا ہے اور خود مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ اسے اپنے فکر و تخیل کی بنیاد و اساس قرار دے رہا ہے یکسر ترک کر دینا چاہیے اور اسلام کی آفاقیت، اور عالم گیریت کو اپنایا جائے۔

مسلمان جب تک اس بت کو چکنا چور نہیں کر دیتے صحیح معنی میں مسلمان نہیں بن سکتے۔

اور جب تک سچے مسلمان نہیں بن جاتے، ان انعامات کے سزاوار نہیں ہو سکتے جو مرد مومن کے لیے خدا نے مقدر کر رکھے ہیں۔

یہ گُر بار بار اقبال اپنی قوم کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں!

اقبال کی ایک نہایت ہی اہم معنی خیز اور اثر آفریں نظم "مذہب" کے نام سے ان کے مجموعۂ کلام میں ملتی ہے، اس میں انھوں نے اپنے اس نظریے کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!!

اقبال کی یہ دعوت، ان کے نطق و کلام کا خلاصہ ہے، زندگی بھر وہ یہی دعوت دیتے رہے، اور جب پہلے پہل، اپنی قوم تک انھوں نے یہ دعوت پہنچائی تو، صرف ایک فرض ہی نہیں ادا کیا، ایک جہاد کیا،!

یہ دعوت اس وقت منظر عام پر آئی جب اسے سننے والے اور ماننے والے ناپید تھے۔

لیکن بہت جلد یہ دل کے کانوں تک پہنچ گئی، اور قلب مسلمان کی آواز بن گئی۔

اگر یہ دعوت بروقت نہ دی گئی ہوتی تو پاکستان کے بننے میں، اور مسلمانوں میں قومی انفرادیت کا شعور پیدا ہونے میں بہت زیادہ دیر لگ جاتی،!

یہی دعوت تھی جس نے مسلمانوں کی یاس کو آس سے بدلا، اور ان میں ایک نئی روح پیدا کر دی!

علامہ شبلی کی شعلہ نوائیاں

طرابلس کی جنگ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی تھیں، محاذ بلقان نے ان کے اندر اضطراب اور غم و الم کی کیفیت پیدا کر دی، وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ اسلام کی بے حرمتی پر خاموش رہیں، اسلام کے پاسبانوں کو خاک و خون میں لتھڑتے، لقمۂ اجل بنتے، جام شہادت پیتے، مردانہ وار شمشیر و سناں، اور توپ و تفنگ کے سامنے سینہ کھول کر آتے دیکھیں اور خاموش رہیں یہ ان کی ملّی حمیّت اور قومی غیرت کا امتحان تھا، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس سخت اسلوب امتحان میں وہ ناکام رہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ملک میں قیامت برپا کر دی، اپنی قوم میں ایک ولولۂ تازہ پیدا کر دیا، بلکہ اپنی شان دار مثال پیش کر کے دوسرے اسلامی ممالک کے لیے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا۔

طرابلس کے سلسلے میں اقبال کی شعلہ نوائیوں اور انقلاب فکر و نظر کا ذکر گزشتہ ابواب میں ہو چکا ہے، اب دیکھیے بلقان کی جنگ نے کس طرح علماء کے حجروں کو میدان کارزار میں تبدیل کر دیا، عبا اور قبا، جبّہ اور عمامہ، عصائے شیخ اور طرۂ زاہد نے کیوں کر فوجی وردی، اور شمشیر و سناں، نعرۂ جنگ، اور رجز خوانی

کی صورت اختیار کرلی۔

علامہ شبلی نعمانی

شبلی ایک عالمِ دین تھے۔ ایک مورخ تھے۔ ایک محقق اور نقاد تھے۔ سیاست سے اور سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ تھے، ان کی زندگی جس چیز سے عبارت تھی وہ تھی "فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے" لیکن بلقان کی جنگ نے اس گوشہ نشین عالم کو کتاب و فراغت اور گوشۂ چمن کی آسودگی سے نکال کر "سوق عکاظ" میں پہنچا دیا، اور عرب رجز خوانوں کی طرح دلوں کو گرما دینے اور قلوب میں ولولۂ تازہ پیدا کر دینے اور روح و تن میں آگ لگا دینے والے اشعار سے فضا بدل دی،۔

مسلمانوں کا سیاسی مرکزِ ثقل، اب علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کا صدر دفتر بھی یہیں تھا، قیصر باغ کی بارہ دری میں ایک عظیم الشان جلسہ جنگ بلقان کے سلسلے میں، تاثرات ملّی کے اظہار و ابلاغ کے لیے منعقد ہوا، اس جلسے میں یہ بوڑھا عالم اور دیرینہ سال مورخ "شہر آشوب اسلام" کا رجز نامہ لے کر اٹھا، لمبا قد، سفید داڑھی، سر پر سفید پگڑی، لوگ سمجھے یہ واعظ کہے گا۔ کسی نے خیال کیا یہ کوئی علمی مقالہ پڑھے گا، بعض کو گمان گزرا چند آیتیں تلاوت کرکے اور چند حدیثوں کو پیش کرنے کے بعد بیٹھ جائے گا، لیکن یہ بوڑھا شخص، سامنے آیا لوگوں نے اس کی آواز سنی تو دنگ رہ گئے، ہاں یہ خود بوڑھا تھا، لیکن اس کی آواز جوان تھی، اس آواز میں ترنم بھی تھا اور نغمگی بھی، درد بھی اور سوز بھی، جوش بھی اور ولولہ بھی، خنجر کی تیزی بھی اور شمشیر کی کاٹ بھی، یہ نثر میں موتی نہیں بکھیر رہا تھا اشعار پڑھ رہا تھا۔ ان اشعار کے تیور، ان کا بانکپن، ان کا زور اور جوش، ایسا معلوم ہوتا تھا پیکرِ خاکی سے صورِ اسرافیل کی آواز نکل رہی تھی۔ اس نے اپنا شہر آشوبِ اسلام شروع کیا۔ اس کی زبان گویا ہوئی:۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

شاعر کا پرسوز سخن، درد میں ڈوبی ہوئی آواز، واقعات و حقائق کا بیان ان سب چیزوں نے مل کر مجمع پر سناٹا طاری کرایا تھا۔ یہ لوگ جو سامنے بیٹھے تھے زندہ تھے۔ زندگی سے بھرپور تھے، لیکن اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہے نہ حرکت نہ جنبش۔ یکایک شاعر کی آواز پھر ابھری:۔

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ بھیتا ہے یہ ترکی کا مریض نیم جاں کب تک؟
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ میداں کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک

یہ اشعار نہ تھے، نعرۂ سروش تھا، کون آنکھ تھی جو اشکبار نہ ہو؟ کون دل تھا جس کی دھڑکن بڑھ نہ گئی ہو؟ کون مسلمان تھا جو اس رودادِ ستم کو سن کر بے قرار نہ ہو گیا ہو؟ یہ گل و بلبل کی شاعری نہیں تھی، یہ زلفِ رسا اور کاکل پرخم کا بیان نہیں تھا، یہ شبِ ہجر اور دردِ فراق کی داستان نہ تھی، نہ اس میں حسن کی شوخیاں تھیں، نہ عشق کی بے تابیاں، نہ معاملہ بندی تھی، نہ محاکات، یہ نئی قسم

کی شاعری تھی، اور نئی شاعری بھی وہ جو اپنے اندر ندرت کا مزید پہلو رکھتی تھی۔ نہ اس میں مناظرِ قدرت کا بیان تھا، نہ مظاہرِ فطرت کی گل کاریاں، نہ پھولوں کا قصہ تھا نہ طلسم کا، نہ برکھا رت کا سماں تھا، نہ شام وسحر اور طلوع وغروب کی منظر کشی۔ یہ جذبات کی ترجمانی تھی، یہ ملّی شعور کا بیان تھا، یہ مردِ مومن کے لیے پکار تھی، للکار تھی، یہ دعوت عمل تھی، جہاد کی دعوت، سرفروشی کی دعوت، ایثار اور قربانی کی دعوت، ناموس اسلام پر مر مٹنے کی دعوت، خلافت اسلامیہ کے تحفظ اور بقا کے لیے موت کو لبیک کہنے کی دعوت، اور ٹھیک اس وقت جب شاعر کا طلسم معنی قائم ہو چکا تھا، اس کی آواز ایک مرتبہ پھر در و دیوار سے ٹکرائی، یہ غلام ملک کا رہنے والا، یہ غلام قوم کا فرد، یہ فرنگی سامراج کا غلامِ بے دام، اپنے آقا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا:-

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے؟ یہ خشر انگیزیاں کب تک؟
یہ جوش انگیزیِ طوفان بیداد و بلا تا کے؟
یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک؟
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کب تک
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

شاعر کا طوفانِ تکلم جاری ہے اور مجمع مدہوش اور گوش برآواز ہے

اور شاعر کہہ رہا ہے :-

یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر فشاں کب تک

اور اس کے بعد شاعر بغیر کسی خوف و دہشت کے صاف صاف فرنگی آقاؤں سے کہتا ہے

کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی !
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

اور فرنگی آقاؤں کو جھاڑ کر ان کے سامنے حق کا کلمہ بلند کر کے ان کی اسلام دشمنی اور مسلم آزاری کو برافگندہ نقاب کر کے، ان کے خبثِ باطن، تعصب، اور انسانیت کشی کے حقائق کی تصویر کھینچ کر اب وہ اپنی قوم کو للکارتا ہے، ابھارتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے :-

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

اس طرح لہو گرمانے کے بعد شاعر کہتا ہے کہ یہ جو اپنی گردن پر تم نے کھوپڑی کا مینار قائم کر رکھا ہے جب تک زمین پر لڑھکتا نظر نہیں آتا اسلام سربلند نہیں ہوسکتا۔ یہ زندگی جس کی حرص میں بار بار مرتے ہو، جب تک اسلام پر قربان نہیں کر دیتے وہ زندگی سے محروم رہے گا۔ اور تم، تمھاری یہ زندگی، تمھاری یہ اجتماعیت تمھاری یہ قوم، تمھاری یہ ملت، تمھاری یہ تعداد، تمھارا یہ وجود کس کام آئے گا اگر اسلام نہ رہا؟ اگر خلافت اسلامیہ مٹ گئی؟ اگر فرنگی استعمار نے حرمین شریفین کے پاسبانوں اور نگہداروں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تو؟ بہرحال ایک دن مروگے اور خدا کے حضور میں پیش ہوگے، بتاؤ جب خدا سوال کرے گا تم نے میرے آخری دین کی حرمت کے لیے، آخری رسولؐ کے ناموس کے لیے، میرے آخری پیام کے فنا و بقا کے لیے کیا، کیا تو کچھ جواب دے سکو گے؟ سوچو، سمجھو اور خوب اچھی طرح یاد رکھو:۔

پرستارانِ خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم، شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

اور اس کے بعد شاعر ایک مرتبہ پھر دعوتِ فکر اور دعوتِ عمل دیتا ہے۔ اس دعوت میں تبلیغ بھی ہے تلقین بھی تذکیر بھی اور موعظت بھی:

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بارِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اُڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صیاد افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک

غزل ہو یا قصیدہ، نظم ہو یا گیت، مقطع کی حیثیت جانِ سخن کی ہوتی ہے، اس نظم کا آخری شعر جو مقطع بھی ہے واقعی جانِ سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک

یہ جلسہ ترکوں کے امدادی فنڈ کی فراہمی کے لیے ہوا تھا۔ جیسا کہ خود شاعر نے اپنے مکتوب بنام مولانا ظفر علی خاں میں تحریر کیا ہے۔ اس نظم کے تاثر اور اثر انگیزی کے بارے میں شبلی کے شاگرد رشید اور جانشین سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے

"خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا، معلوم ہوتا تھا یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے" خواجہ کمال الدین اس زمانے میں اشاعت اسلام کی غرض سے لندن (بشپ گیٹ نمبر ۲۶) میں مقیم تھے، اس نظم نے ہزاروں میل دور سے ان پر جو اثر کیا اس کا ذکر اس خط میں ہے جو انھوں نے لندن سے مولانا کو لکھا تھا

"اگرچہ ہزار کوس دور بیٹھے ہوئے کسی بات نے مجھے بچوں کی طرح رلایا تو آپ کے طبع زاد جدید کے اس مصرعے نے

"چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک"

کیا حقیقت ہے اور صداقت ہے اور کیسا یاس افزا منظر سامنے آجاتا ہے اللہ تعالیٰ رحم کرے"

علی گڑھ کالج کے طلبا میں بیداری

جنگ بلقان کے سلسلے میں مسلمانوں کے شعور اور بیداری کا یہ عالم تھا کہ اسی زمانے میں پہلی مرتبہ، علی گڑھ کالج، سرسید احمد خاں کا قائم کیا ہوا کالج، جسے

عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جوش ملّی اور جذبہ قومی کا گہوارہ بن گیا۔ حسرت موہانی تو خیر اس سے پہلے ہی میدان میں آچکے تھے۔ لیکن شعیب قریشی، خلیق الزماں، عبدالرحمٰن صدیقی، عبدالعزیز انصاری، منظور محمود، اور بہت سے دوسرے نوجوان جذبۂ جہاد اور جذبۂ خدمت سے سرشار ہو کر تعلیم کو خیرباد کہہ کر ہر قربانی دینے کے لیے آمادہ اور مستعد ہو گئے۔ کالج کے طلبا نے بلقان فنڈ میں روپیہ دینا شروع کیا اور اس کی صورت یہ نکالی کہ سادہ غذا پر اکتفا کیا، لذات اور نعمات سے قطع تعلق کر لیا اور اس سے جو رقم بچتی، اور خاصی ہوتی، بلقان فنڈ میں ماہ بہ ماہ جمع کر دی جاتی، علی گڑھ کے طلبا کی یہ روش اس حقیقت کی غماز تھی کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے، اور قوم کے یہ نونہال ملی معاملات میں کس طرح اور کس بے جگری سے حصہ لیں گے۔

گورنر یوپی کی علی گڑھ کالج کے طلبا کو نصیحت

چنانچہ صورت حال کا جائزہ لینے، اور اس فضا کو بدلنے کے لیے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (یوپی) لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن بذات خود علی گڑھ تشریف لائے۔ اور ایک بہی خواہ کی حیثیت سے دستخط کرتے ہوئے طلبا سے فرمایا کہ:-

"اپنے وقت کا بڑا حصہ تعلیم و تحصیل میں صرف کریں، بھوکے رہ کر اور معمولی غذا کھا کر اپنی صحت برباد نہ کریں۔"

اس نصیحت کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ طلبا اپنی وضع اور اصول پر قائم رہے اور ایک اولڈ بوائے شوکت علی نے "انجمن خدام کعبہ" شیخ طریقت اور عالم باعمل، مولانا قیام الدین عبدالباری کے زیر سایۂ عاطفت قائم کر کے نہ صرف علی گڑھ کالج بلکہ سارے ہندوستان میں جوش اور ولولے کی ایک نئی دنیا آباد کر دی

اس لیے کہ شوکت علی کا دوسرا نام عمل تھا، شوکت کی ذات سے اس لفظ کو جدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کامریڈ، الہلال اور زمیندار خدام کعبہ کے ترجمان بن گئے۔ اور حکومت کا یہ ایک بہت بڑا عہدے دار، ملازمت سے، گراں قدر مشاہرے سے، شان دار مستقبل سے، عیش و تنعم کی زندگی سے، اقتدار و اختیار کی لامحدود وسعتوں سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو کر بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے چلنے کے لیے مجاہدانہ اور سپاہیانہ شان سے جد و جہد و سعی کے میدان میں کود پڑا ظاہر ہے حکومت ان سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، مسلمانان ہند یا علی گڑھ سابق اور موجودہ کے سپوت، اگر وہ بلقان پر نفریں و ملامت تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھتے، یا تھوڑا بہت سرمایہ اکٹھا کر کے ترکی حکومت کو بھیج دیتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن یہاں تو انقلاب کے آثار نظر آنے لگے تھے، جس کا رخ بلقان کے بجائے انگلستان کی طرف تھا اور اس انقلاب کو برداشت کرنے کے لیے کسی قیمت پر بھی حکومت تیار نہیں ہو سکتی تھی، کیوں کہ وہ عالی ظرف نہیں تھی اور وہ اپنے سامراج کو بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی قائم اور باقی رکھنا چاہتی تھی، اور اس کے دفاع و تحفظ کے لیے کسی سختی اور تشدد سے گریز کرنے کو تیار نہیں تھی، چنانچہ اس کی نگاہِ خشم آلود، اور جبینِ پر شکن کے اسرار و رموز قوم اور مذہب کے مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینے والے اصحاب باصفا کی سمجھ میں فوراً آ گئے علی گڑھ کے ایک دیرینہ اولڈ بوائے اور اہل مشاہدہ نے لکھا ہے۔

"ملازم اولڈ بوائز میں سے بعض نے حکام کے خوف سے ترکی ٹوپی پہننا اور اپنے نام کے ساتھ "علیگ" لکھنا ترک کر دیا"

میڈیکل مشن اور ڈاکٹر انصاری

حکومت ہند کا دارالحکومت اب کلکتے کے بجائے دہلی بن گیا تھا وائسرائے بہادر

مع اپنی اگزیکٹو کونسل کے دہلی میں نزول اجلاس فرما چکے تھے، محمد علی نے بھی اپنا دارالحکومت کلکتے سے دہلی منتقل کر لیا اور کامریڈ کوچہ چیلاں سے نکلنے لگا اسی زمانے میں محمد علی نے کامریڈ میں "چوائس آف دی ترکس" کے عنوان سے ۳۶ گھنٹے کی مسلسل نشست کا مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو انگریزی ادب میں ایک یادگار حیثیت اختیار کر چکا ہے، لیکن وہ بیک وقت سیف و قلم اور صاحب قول و عمل تھے، بلقان کی جنگ میں جب دول مغرب کی مادی امداد سے ترکوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تو محمد علی نے طے کیا کہ میدان جنگ کے زخمی ترکوں کی دیکھ بھال، مرہم پٹی، نرسنگ اور تیمارداری نیز علاج معالجے کے لیے ایک طبی وفد بھیجا جائے، محمد علی نے وفد کے مصارف کے لیے قارئین سے اپیل کی لیکن یہ اپیل کرنے سے پہلے ہی وہ وفد بھیجنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور ڈاکٹر انصاری کو اس وفد کا لیڈر بنا کر بھیجنے کا پختہ عزم کر لیا تھا، اردو کے زندہ جاوید ادیب اور محمد علی کے جاں نثار دوست میر محفوظ علی بدایونی اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ

"جب سابقہ قرارداد سے انحراف کرتے ہوئے انجمن ہلال احمر دہلی نے وفد کے مصارف برداشت کرنے سے انکار کر دیا تو محمد علی نے مجھ سے پوچھا "ہمارے پاس کتنی رقم ہے؟" میں نے کہا اتنے ہزار اتنے سو روپے، کہنے لگے "الحمدللہ ہمارے پاس کافی رقم ہے۔ انصاری سے میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جائے گا، اور ضرور جائے گا، میرے پاس دس روپے بھی ہوتے جب بھی ہمت نہ ہارتا۔ تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو۔ رقم کی فراہمی میرے ذمے۔

اسی رات اپنے خدمت گار محمد حسین سے کہا "جا کر میرے کمرے میں لیمپ تو جلا دے" پھر کمرے میں جا کر کامریڈ کے لیے مضمون لکھا، جس میں مسلمانوں سے مشن کے چندے کے لیے وہ دل ہلا دینے والی اپیل کی جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپوں کی بارش کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس

پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوئے، اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔"

نومبر ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر انصاری کا میڈیکل مشن محمد علی کے فراہم کردہ سرمائے سے ترکی روانہ ہو گیا۔ اس کے ممبروں میں شعیب قریشی، خلیق الزماں، عبدالرحمٰن صدیقی عبدالعزیز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے مگر بقول مولانا سید سلیمان ندوی (مرحوم)

"جوش کا یہ عالم تھا کہ تعلیم چھوڑ کر زخمی مسلمانوں کی مرہم پٹی کرنے چل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر رحمن مرحوم (سابق میڈیکل آفیسر بھوپال) انگلینڈ میں اپنی تعلیم سے فارغ ہی ہوئے تھے، وہیں سے چل کر سیدھے قسطنطنیہ پہنچے۔ ڈاکٹر نعیم انصاری بھی وفد کے ہمراہ تھے اور وہ بھی انگلینڈ سے آکر ملے تھے۔

ڈاکٹر انصاری سے علامہ شبلی کی عقیدت

وفد کی روانگی کا منظر، مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"مولانا شبلی اور ڈاکٹر صاحب کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل جوان تھے اور مولانا بوڑھے، اس پر بھی یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ ہو کر دہلی جا رہے ہیں۔ لکھنؤ کے چند ممتاز لوگ الوداع کہنے کو موجود ہیں۔ گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ڈبے کے دروازے پر کھڑے وداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعتہً اس ہمہ تن جوش شیخ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جابروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر

جھک گیا۔ آنسوؤں نے اس کی گرد و غبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لیے اور گاڑی اسلامی غیرت وحمیت کے ان گہرہائے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھ گئی۔"

اس موقعے پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ڈاکٹر انصاری اور علامہ شبلی میں خوردی بزرگی کا رشتہ بھی قائم تھا ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی حکیم نابینا، علامہ کے ہم درس رہ چکے تھے۔

علامہ شبلی کا ایک فتویٰ

اس زمانے میں بقر عید آگئی مولانا شبلی کی رائے تھی کہ مسلمانان ہند اس سال قربانی کی رقم ترکی فنڈ میں داخل کر دیں۔ فقہ کی رو سے انھیں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا تھا۔ مفتی عبداللہ ٹونکی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے بھی تائید کی، مولانا نے اپنا فتویٰ اخبارات میں شائع کرا دیا، جس پر دھڑا دھڑ روپیہ اس فنڈ میں جمع ہونے لگا۔ مولانا ظفر علی خاں کو اس فتوے کے ماننے میں تامل تھا۔ انھوں نے اپنا شبہ اپنے استاد کو لکھ بھیجا۔ نومبر ۱۹۱۲ء کو مولانا نے ظفر علی خاں کو جواب لکھا:

"میں نے جو فتویٰ لکھا ہے اس سے علمائے فرنگی محلی بھی متفق ہیں، اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے۔ ہدایہ میں اس کا جزیہ موجود ہے۔ البتہ ہدایہ میں اس کا صرف جواز موجود ہے۔ اور میں نے افضلیت کا فتویٰ دیا ہے، اس قدر میرا اجتہاد ہے۔ بھائی، ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی، موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیلؑ پر مقصود تھی، کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟"

اس کے بعد مولانا نے ۱۷ نومبر ۱۹۱۲ء کو ایک گشتی خط اس شبہے کے ازالے کے لیے بغرض اشاعت روانہ کیا، جو اکثر اخبارات میں شائع ہوا۔ مولانا نے لکھا تھا:

"بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ اگر ترکوں کی ہمدردی میں، قربانی کی بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے۔ اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے، ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آیندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے؟ قربانی شعائر اسلام ہے۔ مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی قوم کی پرواہ کر سکتے ہیں؟۔"

غرض جنگ بلقان اپنی پوری خوں آشامیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترک اورنہ (ایڈریانوپل) تک پسپا ہو گئے۔ پھر یہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن نصرتِ الٰہی نے کام کیا، ترکوں کے ایک جگر دار حملے نے ہاری ہوئی بازی جیت لی اور انھوں نے اورنہ (ایڈیانوپل) کو جو یورپ میں ان کا پایۂ تخت تھا دوبارہ لے لیا۔ مسلمانانِ ہند میں اس فتح نے جوشِ مسرت کی ایک لہر دوڑا دی۔ گھر گھر چراغاں ہوئے اور نشاط بے پایاں کا اظہار کیا گیا۔ شاعر کا حساس دل اس سرورِ بے نہایت کے موقع پر کیونکر خاموش رہ سکتا تھا، بے ساختہ اس کی زبان پر ترانۂ فتح جاری ہو گیا اور ایک عجیب کیف و سرخوشی کے عالم میں اس کے

تاثرات اشعار کے قالب میں ڈھلنے لگے :

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق
اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملت خیر الامم ہے تو!
تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود
مغرب ترا ہی عرصہ گہہ ترک تاز ہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں
اب بھی فنائے دشمن ہستی کا راز ہے
رنگیں جو ہے مرقع عالم کا ہر ورق
شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ہے

یونی ورسٹی کا قیام اور حکومت کی شرائط

ادھر یہ کچھ ہو رہا ہے ادھر اندرون ہند بھی حکومت کی مسلم آزاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔

مسلمانانِ ہند علی گڑھ کالج کو، مسلم یونی ورسٹی بنانے پر تلے ہوئے تھے اس سلسلے میں حکومت نے پہلی شرط لگائی کہ کم از کم تیس لاکھ کا سرمایہ فراہم کیا جائے۔ یہ مہم بھی بڑی حد تک آغا خان کے اخلاص اور شوکت علی کے جوشِ عمل نے پوری کر دی۔ اب حکومت نے نت نئی شرطیں عائد کرنا شروع کر دیں۔

مسلم یونی ورسٹی کے بجائے یونی ورسٹی نام "علی گڑھ یونی ورسٹی" رکھا جائے۔

یونی ورسٹی کے چانسلر ملک معظم ہوں، یہ منصب وائسرائے کو ملے گا۔

یونی ورسٹی اگرچہ اقامتی ہوگی لیکن اسے دوسرے کالجوں کے الحاق کا حق حاصل

نہیں ہوگا۔

یہ سرکاری شرطیں سر ہارٹ کورٹ بٹلر ممبر تعلیمات حکومت ہند کی تھیں، جو بعد میں یوپی کے گورنر بنے اور مسلمانوں سے اتنی راہ و رسم پیدا کی اور سر علی محمد خاں راجہ محمود آباد کی شخصیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی مسلم نوازی کے جرم میں بدنام ہوگئے۔ لیکن جو غلطیاں وہ کر چکے تھے، اس کی تلافی نہ ہوسکی۔ مسلمانوں کو یہ شرائط نہ منظور تھیں، نہ کی جا سکتی تھیں۔

نواب وقار الملک نے ان شرائط پر بیان دیتے ہوئے کہا:

"ایسی یونی ورسٹی کو دور سے سلام"

مولانا محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد اور دوسرے احرارِ ملت نے اس کے خلاف سخت جدوجہد کی اور رائے عامہ کو بیدار کیا، لیکن حکومت نے صرف ہندوؤں کے آگے جھکنا سیکھا تھا، مسلمانوں کو تو وہ ہمیشہ کچلنے اور پامال کرنے پر آمادہ رہتی تھی۔ چنانچہ آخر وقت تک وہ راج ہٹ پر قائم رہی۔ اور جو ترمیمیں دکھاوے کے لیے منظور کیں وہ بھی معمولی۔ لیکن اس باب میں خود مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے تھے، جس سے حسب عادت حکومت نے پورا فائدہ اٹھایا اور مسلمان حسبِ معمول گھاٹے میں رہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری
اور
میڈیکل مشن کی خدمات

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں محاربۂ بلقان اور ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن سے متعلق کچھ ضروری مواد پیش کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کے غم والم، جوش وخروش اور ہاؤ ہو کے اصل اسباب کیا تھے؟ اور کس لیے مسلمان اپنے عافیت کدے سے نکل کر میدان عمل میں اتر آئے؟ اس سلسلے میں برطانوی حکومت کی جو روش رہی اس کے بعض پہلو بھی زیر بحث آئیں گے۔

ایسکوییتھ اور گرے کی اشتعال انگیزی

مسلم ہندوستان کے اضطراب سے حکومتِ برطانیہ ناواقف نہیں تھی وہ ان کی اشک شوئی بھی کرنا چاہتی تھی، لیکن ترکیہ کے ساتھ بالخصوص اور مسلمان حکومتوں کے ساتھ بالعموم اپنی معاندانہ پالیسی قائم اور برقرار رکھنے پر مصر تھی چنانچہ برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈورڈ گرے نے اسلامی سلطنتوں کے ساتھ برطانیہ کے طرز عمل پر بحث کرتے ہوئے دارالعوام (پارلیمنٹ) میں فرمایا:-

"ہمارا طرز عمل رواداری کے خلاف نہ ہونا چاہیے اور کسی اسلامی مملکت کے خلاف بغیر کسی خاص سبب کے ہمیں دباؤ نہ ڈالنا چاہیے"

لیکن سلطنت برطانیہ کے باہر کسی مسلمان طاقت کو ان نتائج سے بچانے کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں جو اس کے اپنے فعل سے پیدا ہوں ۔"

یہ بڑی معنی خیز بات تھی، یعنی مسلمانانِ ہند کو تو بیرونی حملے سے بچانے کے لیے حکومت برطانیہ آگے بڑھ سکتی تھی، لیکن سلطنتِ برطانیہ سے باہر جو اسلامی حکومتیں ۔۔ خود برطانیہ کی سازشوں اور دراندازیوں کے باعث مصروف دفاع وجہاد تھیں ان کی تائید برطانیہ کی طرف سے نہیں ہو سکتی تھی ۔!

اسی طرح مسٹر ایسکویتھ وزیر اعظم برطانیہ نے، جب سالونیکا یونان نے ترکوں سے چھین لیا تھا ۔ فرمایا تھا :۔

"فاتح کو فتح کے ثمرات سے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔"

دوسرے الفاظ میں اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ سالونیکا پہ یونان کا غاصبانہ قبضہ دائمی حیثیت اختیار کر چکا ہے ۔ متارکۂ جنگ کا کوئی اعلان اور صلح و امن کا کوئی معاہدہ اب سالونیکا کو یونان سے واپس نہیں لے سکتا ۔

لیکن جب بہادر ترکوں نے سالونیکا یونان سے چھین لیا تو انگلستان وغیرہ میں صفِ ماتم بچھ گئی، اس پر جل کر ظریف اور حکیم شاعر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا :۔

سالونیکا سے اب تو سالو نکالو ہم کو !

کامریڈ کا لاجواب تبصرہ

یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی جو مقطع میں آ پڑی تھی، گرے اور ایسکویتھ کے فرمودات پہ تبصرہ کرتے ہوئے "کامریڈ" نے (۱۶ اگست ۱۹۱۳ء) میں بڑی چبھتی ہوئی اور پتے کی باتیں کیں ۔ اس نے لکھا :۔

"گزشتہ دو سال سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو جوش ترکی اور ایران کی حمایت سے پیدا ہو گیا ہے اس کا اتنا اثر تو ضرور

ہوا کہ انگلستان کے وزرا جب کبھی غیر ممالک کے ساتھ اپنے طرز عمل سے بحث کرتے ہیں تو ملک معظم کی سات کروڑ مسلم رعایائے ہند کا خیال بھی کر لیتے ہیں، لیکن ہم نے سوا زبانی تشفی اور لفظی تسکین کے کبھی ان کے طرز عمل میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھی جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ واقعی مسلمانوں کے جذبات اور خواہشات کا کچھ خیال رکھا جاتا ہے، بلکہ اس کے برخلاف برطانیہ کے ذمے دار وزرا نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے اس صریح قلبی عداوت اور دلی بغض کا ثبوت ملتا ہے جو ان حضرات کے دلوں میں اسلامی حکومتوں کے خلاف بھرا ہوا ہے اور اس طرح گویا یہ اپنے ذاتی جذبے کے سامنے مسلمانوں کے احساسات کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جنگ بلقان کے بارے میں حکومت برطانیہ کی روش پر ہم جب غور کرتے ہیں تو اس کے طرز عمل میں ایک عجیب طرح کا اجتماع اضداد اور قول و فعل کا اختلاف پاتے ہیں، ترکی کو اس بات کا یقین تھا کہ نتیجۂ جنگ خواہ کچھ بھی ہو، ملکی حد بندی میں کسی طرح کا تغیر نہیں ہوگا مگر مسٹر اسکوبیتھ نے فرما دیا کہ فاتح کو اس کے ثمرات فتح سے محروم نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس طرح بقول خود وہ یورپ میں عیسائیت کی تجدید دیکھ رہے تھے مگر جب ترکوں نے دوبارہ ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا تو ریاست ہائے بلقان کے گلے میں صرف ترکی ہی ایک ایسی سیاہ بھیڑ تھی جس کے لیے معاہدے کی پابندی ضروری تھی۔ باقی دوسری عیسائی ریاستوں کو ایک جدی ہونے کی حیثیت سے اختیار تھا کہ اپنے بزرگوں کی میراث جس طرح چاہیں باہمی طور پر تقسیم کر لیں اور معاہدۂ لندن کے نگہ دار

صرف اس بات کی نگرانی کرتے رہیں کہ ترکی سرحد پار نہ کر سکے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایڈورڈ گرے کس بنیاد پر اتنی بڑی مسلم تعداد کو اپنی غیر ملکی پالیسی سے خارج کر دیتے ہیں کیا برطانیہ پر مسلمانوں کی ذمے داری صرف اتنی ہے کہ اس کے مقبوضات کے اندر مسلمانوں کے قومی جذبات اور احساسات کا لحاظ کیا جائے۔ اور باہر نظر انداز کر دیا جائے حالانکہ جب کبھی ضرورت پڑی تو ہندوستان کی سرحد اور افریقہ میں (مسلمانوں) نے گورنمنٹ کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اپنی اور اپنے عزیز بھائیوں کی جان تک کی پروا نہیں کی۔ کیا اس سلسلے میں مسلمان برطانیہ سے اس بات کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ جن سلطنتوں کے ساتھ ہم کو تاریخی اور مذہبی حیثیت سے ہمدردی ہے برطانیہ ان کے قیام میں مدد دے یا کم سے کم ان کے دشمنوں کے ساتھ ایسے معاہدوں میں شریک نہ ہو جو ان کی تباہی کا باعث بنیں ــــ سر ایڈورڈ گرے نے غیر ملکی معاملات میں مسلمانوں کو مایوس کن جواب دینے کے بعد اس طور پر اشک شوئی کرائی ہے کہ سلطنت کے اندر کے تمام حقوق ملحوظ رہیں گے اول تو ہم نہیں سمجھتے کہ وزیر خارجہ کو اندرونی انتظامات کے متعلق کہاں تک اپنے اوپر ذمے داری لینے کا حق حاصل ہے اور دوسرے خود ہندوستان کے اندر جس طرح ان کی عرض داشتیں مسترد کی جا رہی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یا تو حکومت ہند پر وزارت برطانیہ کا کوئی اثر نہیں ہے یا مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا مقصد صرف موقع کو ٹال دینا تھا یا پھر حکومت ان جذبات کو مسلمانوں کے سچے جذبات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے!"

ہمدرد کا ایک دل گداز مضمون

بلقان کے حوادث نے، ترکوں کی مظلومیت نے، مسلمانوں کو کس درجہ متاثر کر رکھا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جو دانش ور اور ادیب سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے وہ بھی تڑپ اٹھے، سید سجاد حیدر یلدرم کا ایک دل گداز مضمون ۵ جون ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں شائع ہوا تھا، جس کی چند سطریں یہ ہیں :-

"یورپ سے مسلمانوں کا اخراج ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ ترکوں کے مصیبت زدہ، خانماں برباد قافلے۔ یونانی غارت گری اور بلقانی ستم رانی کے باعث ۔ اپنے وطن کو، اپنے گھر کو۔ اپنی زمین کو۔ اپنے آبا و اجداد کے کھیتوں کو چھوڑ کر اور اس طرح چھوڑ کر کہ اپنی باقی ماندہ تاریخ اور محروم نشیمن زندگی میں اب ان چیزوں کا خواب ہی دیکھ سکتے ہیں اور اب انھیں دیس نکالا، آگ کے شعلوں، اور تلوار کے چرکوں کی مشائعت کے ساتھ مل رہا ہے، انھیں اتنی فرصت بھی نہیں دی جاتی کہ اپنے گاؤں کے قبرستان میں جا کر اپنے باپ، ماں، بہن یا بھائی کی قبر پر آخری فاتحہ پڑھ لیں۔ یہ تو وہ ہیں جو آشیاں ویران ہیں۔ بھٹک رہے ہیں مگر اسیر نہیں ہیں۔ اور جو چنگل میں آ گئے اپنے وطن سے نکل نہ سکے ان کے ساتھ یہ احسان کیا گیا کہ زندہ جلا دیئے گئے۔"

یونان، بلغاریہ، سرویا اور دوسری بلقانی ریاستوں نے اتحادی بن کر ترکوں کی مجبوری اور کمزوری سے جس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا اور ترکوں کو جس طرح غیر معمولی نقصان پہنچایا اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا جو ڈاکٹر پوٹیس کے مقالے سے ماخوذ ہیں اس مقالے کا ترجمہ ہمدرد نے ۱۹۱۳ء میں شائع کیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے۔

"یورپین ٹرکی کا جس قدر علاقہ (یونان اور بلقان) نے فتح کیا ہے اس کا پورا رقبہ ایک لاکھ تیس ہزار کلومیٹر ہے، جس میں جو نفوس آباد وہ مفصلۂ ذیل طریقے پر منقسم ہیں۔

مسلمان	۱۷۷۵۰۰۰
یونانی	۱۱۰۰۰۰۰
بلغاری	۷۸۰۰۰۰
سروین	۲۲۵۰۰۰
یہودی	۱۰۰۰۰۰
آرمینین ول	۲۰۰۰۰

ان میں سے بلغاریہ ۲۵۸۰۰۰۰ نفوس اور رقبہ ۲۸۵۰۰ کلومیٹر ہے جس علاقے کا بلغاریہ نے مطالبہ کیا ہے اس کی آبادی کی تفصیل یہ ہے۔

مسلمان	۱۰۲۰۰۰۰
بلغاری	۶۲۵۰۰۰
یونانی	۵۸۰۰۰۰
آرمینی اور جلاشی	۱۴۰۰۰
سروین	۱۲۰۰۰

یونان نے ترکیہ کے جن علاقوں کو فتح کیا اور آسٹریا اور اٹلی ان کا الحاق البانیہ کے ساتھ کرنا چاہتے تھے (تاکہ مسلم اکثریت اقلیت سے بدل جائے) ان کی تفصیل بہ لحاظ رقبہ و آبادی یہ ہے:۔

رقبہ ۱۱۸۰۰ کلومیٹر

کل آبادی ۳۹۰۰۰۰

جس میں :-

یونانی ۲۵۰۰۰۰

مسلمان ۱۴۰۰۰۰

بلغاریہ نے جس علاقے کا مطالبہ کیا ہے اس میں بلغاری عنصر ۲۷ فی صد سے زیادہ نہیں ہے یونانی عنصر ۲۵ فی صد ہے۔

ترکیہ کے حالات

محمد علی نے جو وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی زیر قیادت ترکیہ بھیجا تھا اس کا اولین مقصد تو بے شک یہی تھا کہ ترک مجروحین کی تیمارداری کی جائے، مرہم پٹی کی جائے، علاج معالجہ کیا جائے، لیکن دوسرا مقصد جو کسی طرح پہلے مقصد سے کم اہم نہیں تھا۔ یہ تھا کہ ترکی کی آبادکاری، اقتصادی زبوں حالی اور تعمیر و تطہیر کے سلسلے میں بھی مسلم انڈیا جو کچھ کر سکتا ہے اسے پیش نظر رکھ کر ایک پروگرام وضع کیا جائے اور ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے یہ مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہو سکا۔ لیکن اسے بروئے کار لانے میں جو کچھ بھی ایک غلام ملک کے غلام باشندے کر سکتے تھے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم بینک اور کوآپریٹو سوسائٹی

محمد علی کا عالم اسلام کے سربرآوردہ رہنماؤں کا اور ترکیہ کے اکابر کا خیال تھا کہ ایک مدینہ یونی ورسٹی قائم کی جائے جو ممالک اسلامیہ کی اجتماعی درس گاہ ہو، اس کے بارے میں ڈاکٹر انصاری اپنے مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"دوسرا ضروری سوال مدینہ یونی ورسٹی کا، مرکزی کمیٹی کا ایک جلسہ اس ہفتے ہوا تھا، جس میں اکثر وزراء اور ترکی کے دوسرے اکابر شریک ہوئے تھے، وزیر اوقاف کی خواہش ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے یونی ورسٹی قائم ہو جائے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبر مقرر کیے جا چکے ہیں جس میں میرے

علاوہ ظفر علی خاں بھی شامل ہیں، شیخ عبدالعزیز شاویش پرنسپل مقرر ہوں گے، میں تمھیں تار دے چکا ہوں۔ امید ہے تم ۔ نصاب و نظام یونی ورسٹی کی ترتیب میں پوری توجہ صرف کروگے۔ علی گڑھ کا طراز پیش نظر رہنا چاہیئے۔ مقامی ضروریات کا خاص خیال رکھا جائے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ذریعہ تعلیم عربی ہوگا۔ مہربانی کرکے مولانا شبلی۔ ڈاکٹر اقبال، میجر سید علی بلگرامی، مولوی حمید الدین (فراہی) سے اور جن اصحاب سے مناسب سمجھو مشورہ کرلو۔"

ترکوں کی آبادکاری

اس وفد کو مظلوم اور خانماں برباد ترکوں کی آبادکاری کا فریضہ بھی سونپا گیا تھا۔ اور وفد نے اس سلسلے میں اپنے حدودِ استطاعت کے مطابق بہت کچھ کیا۔ ڈاکٹر صاحب اسی مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"ہندی عثمانی انجمن کے تو آبادکاری کے مزید دو جلسے ہو چکے ہیں، قواعد کا ایک مسودہ تیار کرلیا گیا ہے، جو وزیر داخلہ کی منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ حاجی عادل نے ہمیں اناطولیہ میں زمینوں کی ایک فہرست دی ہے، جو فی الحال حکومت کے پاس ہیں۔ اور جنھیں وہ نوآبادکاروں کے لیے دے گی۔ انگورا میں ریلوے کی ۲۵ ہزار ایکڑ زمین مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ادرنہ میں ایک بہت ہی شاداب قطعہ ۴۵ ہزار ایکڑ کا دستیاب ہوسکتا ہے۔ بروسہ اور قونیہ کے قریب بھی ۲۵ ہزار ایکڑ کے قریب زمین مل سکتی ہے۔ اناطولیہ میں دورہ کرنے سے پہلے ہم سوسائٹی کے قواعد کی وزیر داخلہ کی طرف سے منظوری کے منتظر ہیں۔ ہمیں امید ہے ایک ہفتے سے زیادہ اجازت کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا، میں تم کو اپنے مشن کے ان ممبران کا نام بتاؤں جو کام کی نگہ داشت کرنے کی غرض

ے ستمبر تک قیام کرنے کو تیار ہیں، لیکن تمھیں ابھی سے موزوں آدمیوں کی تلاش میں رہنا چاہیئے جو اگست کے آغاز میں یہاں پہنچ سکیں تاکہ جب پرانے ممبر سبک دوش ہوں تو نئے آدمیوں کو کام میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ بسیم عمر پاشا کو دیہات اور جھونپڑیوں کا عام نقشہ تیار کرنے کے لیے ایک ماہر فن دستیاب ہو گیا ہے، ہر گاؤں تو مکانات ایک مسجد، ایک مدرسہ، ایک ہسپتال اور ایک دھوبی خانے پر مشتمل ہوگا جہاں فن زراعت کی عملی تعلیم دی جایا کرے گی۔ ہر مکان دو منزلہ ہے پہلی منزل میں باورچی خانہ۔ کھانے کا کمرہ، گودام، غسل خانہ اور پاخانہ ہوگا۔ احاطے میں مویشیوں کے لیے اور فصل کا غلہ رکھنے کے لیے ایک چھپر ڈالا جائے گا۔!"

میڈیکل مشن کی عظیم الشان خدمات

طبی وفد کے متعین ممبروں نے اپنے فرائض کس درجہ محنت سے انجام دیے؟ اس پر قاضی بشیر الدین کے ایک خط سے روشنی پڑ سکتی ہے، جو وفد کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے ۱۴ جون ۱۹۱۳ء کو لکھا تھا۔ اور کامریڈ میں شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا تھا۔

"ہم بدستور کام کر رہے ہیں۔ لیکن روزانہ مسلسل کام کرنے سے ہم سب کی تندرستی پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ چنانچہ سب یکے بعد دیگرے بیمار ہو چکے ہیں۔ مگر تین چار دن میں جب ذرا اچھے ہو جاتے ہیں تو پھر کام کرنے لگتے ہیں۔"

غرض وفد نے جس خلوص، محبت اور اسلامی اخوت کو پیش نظر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیئے۔ وہ حیات اسلامیہ کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔

اس سلسلے میں کامریڈ میں شائع شدہ ایک مکتوب (مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پورا مکتوب تو درج کرنا ممکن نہیں جستہ جستہ حصے ملاحظہ ہوں:

"مسٹر شعیب قریشی نے ہز اکسیلنسی احمد عزت پاشا کمانڈر انچیف عساکر ترکیہ کی نوازشات کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا، ہم کو فخر ہے کہ خدا کی عنایت سے ہم اپنے جاں باز فدائیان اسلام ترک بھائیوں کی خدمت کر سکے، یہ وہ خدمت ہے جسے انجام دینے کے لیے سارے مسلمان تڑپ رہے ہیں۔ ہز اکسیلنسی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا۔ افسوس آپ نے ترکی کو اس حالت میں دیکھا کہ اعدا اسے ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور تمام دنیا ان کے درپے آزار ہو رہی ہے۔ کوئی اکیلی طاقت تمام دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہم نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ قدرت خداوندی میں کوئی چارہ نہیں، جو منظور تھا۔ وہ ہوا۔ ہماری سلطنت کا بہت سا قیمتی علاقہ نکل گیا۔ ہمارے بھائیوں پر ناگفتہ بہ مظالم ہو رہے ہیں۔" یہ فرما کر ہز اکسیلنسی انتہائی جوش کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ تاہم سب کچھ کھو کر ہم کو وہ بیش بہا چیز حاصل ہوئی، جو مصائب کی تاریکی میں امید کی روشنی ہے۔ اور جس نے ترک قوم میں ایک نئی روح بیدار کر دی ہے، یعنی ہزاروں میل کے فاصلے پر ہمارے درد میں حصہ لینے والے ہمارے بھائی موجود ہیں، اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اخوت اسلامی اور ہمدردی کی مثال ہمارے سامنے پیش کر کے اس قدر نفع پہنچایا ہے، جسے ہم عثمانی (ترک) کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ ایسا احسان ہے جس سے ترک کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ میں آپ کا اور ہندوستان

کے تمام مسلمانوں کا بحیثیت کمانڈر انچیف عساکر ترکیہ شکریہ ادا کرتا ہوں"
ہز اکسیلنسی کی تقریر نے سب کے قلوب میں کچھ ایسے جذبات پیدا کر دیے
کہ مسٹر شعیب قریشی نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے۔

یہ ہے وہ فصل جو ۱۹۱۳ء میں بوئی گئی تھی، اور ۱۹۶۵ء میں کاٹی گئی۔

اس مضمون میں مسٹر شعیب قریشی کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ وہی شعیب صاحب ہیں جو علی برادران کے دستِ راست رہ چکے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد، ماسکو میں پاکستان کے سفیر اور دہلی میں ہائی کمشنر بھی رہے، کچھ عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔

چند مزید تفصیلات

ایک اور خط جس میں فتوحات بلغار، ان کے مظالم، اور عثمانی (ترک) سلطنت کے جاہ و جلال کا ایک نقشہ سا نظر آ جاتا ہے، اس کے چند اہم حصے یہ ہیں:-

"ترک فوج اس تیزی سے (دشمن پر حملے کے لیے) بڑھی کہ ڈاکٹر بسیم عمر پاشا ہمارے لیے اجازت ساتھ جانے کی حاصل نہ کر سکے، ترکوں نے لوسی برغاس پر قبضہ کر لیا ہے، ایڈریانوپل کی تسخیر کا اس لمحہ انتظار کیا جا رہا تھا، انور پاشا کا مع اپنے جنگی سامان کے ایک دن میں ۸۰ کلومیٹر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے، ایڈریانوپل کی چشم دید شہادتوں سے جو اطلاعیں پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح سات بجے ترک سوار شہر میں دندانہ گھس آئے، اور تمام استحکامات اور سرکاری عمارات پر قبضہ کر لیا، ایک جنرل اور تقریباً دو ہزار بلغاری قید کر لیے گئے، بلغاری ۲۶۰ توپیں بھی چھوڑ گئے، یہودیوں کے ربی (مقتدا) بینڈ بجاتے ہوئے گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلے تاکہ ترکوں کا خیر مقدم کریں، لوگوں کی بشاش نگاہوں اور چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پیشتر

ان پر کتنا ظلم ہو چکا تھا، ترکوں کا استقبال کرنے کے لیے اہالیان شہر کے ساتھ یونانی بھی موجود تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلغاریوں نے اپنے ان پرانے دوستوں کو بھی معاف نہیں کیا، حالانکہ انھوں نے مسلمانوں کے قتل میں بلغاریوں کی پوری مدد کی تھی۔

ہراول کے ساتھ نہ جانے سے ہمیں جو مایوسی ہوئی تھی وہ پورے طور پر زائل ہو گئی جب بسیم عمر پاشا نے ہمیں اپنے ساتھ لے جانے اور ایڈریانوپل ہلال احمر کے ہسپتال میں کام کرنے کے لیے کہا ہم فوراً روانہ ہو گئے، ہم سب چھ تھے، خلیق، غلام احمد، منظور، شعیب اور میں، اور ڈاکٹر فواد، قلعہ احمد پاشا کا چکر کھاتی ہوئی ریل گاڑی قاراسو کی وادی میں داخل ہوئی، یہ وہی مقام ہے جو اس جنگ میں بڑی ہولناک خوں ریزیوں کا منظر رہا ہے، شہر کی مسجد کی بس چار دیواری باقی رہ گئی ہے، چھت ندارد ہے، جس مینارے سے اذان دی جاتی تھی وہ بھی نصف کے قریب ٹوٹا ہوا ہے، آخر ہم شتلجہ آئے، بلغاریوں نے یہاں تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا تھا، مکانات اور مساجد کو گولے بارود سے اڑا دیا تھا، شتلجہ سے لے کر لوسی برغاس تک کسی انسان کا پتا نہیں، ایسا کوئی مکان نہیں جو قابل رہائش ہو، پہاڑیوں میں مویشی تک نظر نہیں آتے ایسا معلوم ہوتا ہے پرندے بھی انسان نما درندوں کے خوف سے بھاگ گئے ہیں ریلوے اسٹیشن، سڑکوں، گاڑیوں، انجنوں، اور پانی کے حوضوں کو برباد کر دیا گیا ہے، اسٹیشنوں کے ترکی نام کھرچ کر اس پر بلغاری نام لکھ دیئے گئے ہیں، مانچسٹر گارڈین کا نامہ نگار ہمارے ساتھ تھا اس نے یہ مظالم دیکھ کر کہا اپنے آپ کو عیسائی کہتے شرم آتی ہے۔"

ہم ایڈریانوپل میں صرف چار روز ٹھہرے، نہایت جوش کے عالم میں ہم جامع سلیم میں داخل ہوئے، صرف تین دن پیشتر اس خوبصورت شہر پر بلغاری پرچم لہرا رہا تھا، بلغاری جوتے پہنے اس میں داخل ہوتے تھے، بعض نے اسے نجس کرنے کی بھی کوشش کی۔

دوسرے روز صبح صبح توپوں کے شور سے ہماری آنکھ کھل گئی معلوم ہوا شہزادہ ولی عہد یوسف عزیز الدین اور پرنس ضیاء الدین شہر کا معائنہ کرنے تشریف لائے ہیں۔ ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا، جس وقت شہزادہ ولی عہد فوج کا معائنہ کر رہے تھے ایڈریانوپل کے باشندوں نے ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا، حاضرین کی تعداد بے شمار تھی، اس میں ہر قوم کے نمائندے شریک تھے یونانی، آرمینی، اسقف (پادری) اور ربی (یہودی پیشوا) بہت سے احباب نے تقریریں کی اور بلغاریوں کی درندگی اور سفاکی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ایڈریانوپل کے تمام (غیر مسلم) باشندے یورپ کے بڑے بڑے دارالخلافوں میں وفود بھجوا رہے ہیں "تاکہ ایڈریانوپل کو دوبارہ بلغاریوں کے حوالے نہ کیا جائے۔

غلام احمد کے پاس عزت پاشا (کمانڈر انچیف) کی ایک بہت بڑی تصویر تھی، وہ خلیق اور منظور کو لے کر ان سے دستخط کرانے پہنچے، عزت پاشا نے دستخط کر دیے، اور تصویر پر یہ الفاظ لکھے "میرے بیٹے غلام احمد کے لیے"، محمد علی پاشا نے منظور کو گاتے اور قرأت کرتے سنا تھا، انھوں نے منظور کی اس قدر تعریف کی کہ عزت پاشا اسے سنے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ انھوں نے دوسرے دن منظور کو اپنے پاس بلایا، عزت پاشا نے ان سے سورۂ "انا فتحنا" قرأت سے پڑھنے کی درخواست کی، منظور نے

بڑی خوش الحانی سے تلاوت کی جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے، اور حاضرین نے مرحبا کی آوازیں بلند کیں!"

اس خط کے لکھنے والے عبدالرحمٰن صدیقی ہیں، جو میڈیکل مشن کے مینیجر تھے، اور علی گڑھ کے طالب علم، تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے، مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے، چند سال ہوئے ہیں کہ انتقال ہوگیا،

خلیق سے مراد چودھری خلیق الزماں ہیں، یہ بھی اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کرکے شریک وفد ہوگئے تھے۔

منظور محمود مرحوم اب اتنے گم نام ہوچکے ہیں کہ ان کا تعارف اس طرح کرانا پڑ رہا ہے کہ مشہور موسیقار طلعت محمود کے والد ماجد تھے، اقبال کے عاشق، محمد علی شوکت علی کے فدائی، قومی جلسوں میں اقبال کا کلام علی برادران اس سے ضرور پڑھواتے تھے، خود وجد کرتے تھے اور دوسروں کو حال میں لاتے تھے،

اپنا کام خیر و خوبی کے ساتھ انجام دے کر ڈاکٹر انصاری اپنے چند رفقاء کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے، بعض ساتھی کچھ عرصے کے لیے رک گئے، اور عبدالرحمٰن پشاوری مرحوم تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو رہے، یہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بیرسٹر پشاور، و سابق صدر مسلم لیگ کے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے ترکی قومیت اختیار کرلی تھی۔ وطن واپس نہیں آئے، تقسیم ہند سے چند سال پہلے ترکیہ ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

نواب وقار الملک کا ایک اہم مکتوب

ڈاکٹر انصاری کے واپسی کے موقعے پر کہ ابھی وہ راستے میں تھے، انتصار جنگ نواب وقار الملک کا ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو ایک اہم مراسلہ شائع ہوا

تھا، نامناسب نہ ہوگا، اگر اس کے بعض پہلو پیش نظر رہیں، نواب صاحب تحریر کرتے ہیں:

"جس وقت یہ وفد روانہ ہو رہا تھا میرا خیال بالکل اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا کہ مجروحین کے علاج معالجے اور تیمارداری کے سوا، جس میں بے شبہ ایک خاص جزو بہت زیادہ ہمدردی کا شامل تھا، کوئی ایسا اہم پولیٹکل نتیجہ بھی پیدا ہو سکتا ہے جس کا سلسلہ اب شروع ہوا ہے، یعنی ہندوستان کے مسلمانوں اور ترکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتۂ اتحاد کا قائم ہونا اور یہ وہ نتائج ہیں کہ جس قدر روپیہ خرچ ہوا، اگر اس سے دس گنا بھی خرچ ہو جاتا تو بھی جو نتائج حاصل ہوئے بہت ارزاں سمجھے جانے کے قابل تھے، آج جو بیج قسطنطنیہ میں بویا گیا ہے اگر مسلمانانِ ہندوستان اپنی مالی امداد سے اس کی آبیاری کرتے رہے تو عنقریب وہ ایک تناور درخت بن جائے گا اور ایسا شیریں پھل لائے گا کہ جو لوگ اس وفد کے مصارف کو فضول خرچی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ غالباً اپنی رائے بدلنے پر آخر کار مجبور ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر انصاری نے وفد کے آرگنائزر محمد علی سے صلاح و مشورے کے بعد۔ جیسا اوپر مذکور ہو چکا تھا۔ ترکوں کی ٹھوس اور تعمیری خدمت کی طرف بھی توجہ کی تھی یعنی اسلامی بینک کا قیام، کوآپریٹو سوسائٹی کی تشکیل، مدینہ یونی ورسٹی کی تاسیس، اور بلقان کے ترک مہاجرین کے لیے نئی بستیوں کی تعمیر، یہ کام بہت بڑا تھا، لیکن غلام آباد ہندوستان کے مسلمان اپنی غربت کے باوجود اسے انجام دینے پر تلے ہوئے تھے، اگرچہ حکومت برطانیہ کی شہ پر، دراندازیوں اور مخالفتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا، اور ان تدابیر کو ناکام بنانے کی سعی و کوشش کا آغاز ہو گیا تھا۔

نواب وقار الملک نے اپنے اس مراسلے میں سنجیدگی کے ساتھ اس طرح ان امور

پر بھی روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"ڈاکٹر انصاری چھ سات روز میں انشاء اللہ بمبئی پہنچنے والے ہیں، وہاں سے تمام بڑے بڑے مقامات پر بذات خود تشریف لے جاکر مسلمانوں کو ترکی تمسکات قرضے کی خریداری کی ترغیب دیں گے، بعض صاحبان کو کچھ غلط فہمیاں ہو رہی ہیں، انہی مسائل میں اناطولیہ میں مہاجر ترکوں کے واسطے نوآبادیاں قائم کرنے کا مسئلہ بھی ہے اس قسم کی نکتہ چینیاں چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے، علیٰ ہذاالقیاس قسطنطنیہ میں ایک اسلامی بینک قائم کرنے کی تجویز پر اعتراض کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے اس قسم کی معذرت ان صاحبوں کی طرف سے ہو سکتی ہے جو چندے میں تو ایک پیسہ نہ دیں اور دنیا جہان کے اعتراضات پیدا کرکے لوگوں کو ترکوں کی مدد سے باز رکھنے کی کوشش کریں، پوری قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب ان اعتراضات کا پڑھنے والا معترضین کے اس مغز تک پہنچتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ٹرکی سلطنت کی حفاظت میں ترک مہاجرین کی نوآبادیاں قائم کی جائیں بہتر یہ ہے کہ دول یورپ کے توسط سے ان کو سابقہ وطن (بلقان) میں واپس بھیجنے کا انتظام کیا جائے، اور انھیں سفاک، بے رحم، اور ناخدا ترس ظالموں کے پنجے میں دے دیا جائے، جنھوں نے ان میں سے بہتوں کو بے گناہ قتل کیا ہے، ان کو لوٹا ہے، ان کی عصمت دری کی ہے، اور کوئی دقیقہ ان کو نقصان، تکلیف اور ذلت پہنچانے کا باقی نہیں چھوڑا، یہ ہیں ہمارے مسلمان ناصح، خدا کے واسطے کوئی بتائے کہ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنا مسلمانوں کی فراست، عزت، غیرت اور حمیت کے شایان ہوگا؟ ایک

وقت یہی دل سوز ناصح ہندوستان کے مسلمانوں کو حجاز ریلوے میں
چندہ دینے سے روکتے تھے، کیا ان نصیحتوں پر عمل کرنے سے مسلمان اپنی
عزت اور وقار قائم رکھ سکتے ہیں؟

میڈیکل مشن کی واپسی

ڈاکٹر انصاری کا طبّی وفد جب بلقان روانہ ہوا تھا تو نائب السلطنت ہند یعنی وائسرائے لارڈ ہارڈنگ اسے شرفِ دیدار اور شرف کلام سے مشرف فرمایا تھا، چھ مہینے تک جنگ کے میدان میں، اس وفد کے سرفروش ممبران نے گراں بہا خدمات انجام دیے، اور جب اختتام کو پہنچی اور خدا کے فضل و کرم سے، کامیابی کے ساتھ اتمام تک پہنچی تو وفد ہندوستان واپس آگیا۔

عظیم الشان استقبال

بمبئی کے ساحل پر جب وفد اترا تو ہزار ہا ہزار آدمی دیوانہ وار استقبال کو موجود تھے۔ پھر باشندگان بمبئی کی طرف سے وفد کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ بمبئی ہمیشہ سے سیاسی نیم سیاسی، اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ہمیشہ سے بڑے بڑے جلسے منعقد ہوتے اور بڑے بڑے جلوس نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن میڈیکل مشن کے ارکان کے اجلال و احترام کے سلسلے میں اور خراج تحسین و عقیدت پیش کرنے کے لیے جو جلسہ منعقد ہوا، وہ بمبئی کی تاریخ میں یادگار اور ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

علامہ شبلی کی روح پرور نظم

اسے حسن اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ اس موقعے پر مسلمانوں کے عہد رفتہ کا نقیب، تاریخ اسلام کا رمز آشنا، کتاب و سنت کا محرم اسرار، اور شہنشاہ عرب و عجم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیرت نگار، شبلی بھی موجود تھا، شبلی نے وفد کی روانگی کے وقت جن تاثرات کا زبان شعر سے اظہار کیا تھا، ان کی تفصیل گزشتہ باب میں حوالہ قلم ہو چکی ہیں، اس موقعے پر پھر یہ مورخ اور شاعر آگے بڑھا، اور اس نے اپنے تاثرات ایک شگفتہ دل آویز، ولولہ آفریں، وجد آور، حقیقت افروز اور روح پرور نظم کی صورت میں پیش کیے، سنیے وہ اپنے مخصوص اور سحر طراز لحن و ترنم کے ساتھ اپنی اور اپنی قوم کی ترجمانی کر رہا ہے:۔

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ خیریت سے آئے ممبران وفد انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی، یہی تھی رسم غم خواری
فراق ملک و ترک خانماں و دوری منزل
خدا کے فضل سے تم نے پکڑیاں جھیل لیں ساری

اور اس کے بعد ذرا یہ منظر کشی اور مرقع نگاری دیکھیے، شاعر نے صورت گری کا کیسا نادر نمونہ پیش کیا ہے، جو مبنی بر حقیقت بھی ہے، اور ان کی فطرت کا نقاش بھی۔ اس منظر نامے میں سوز حسرت، تعلقات محبت اور جذبات کی کشاکش اور کش مکش کی ساری کیفیتیں بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ آگئی ہیں:

تمھارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہ ہائے درد و جوش گریہ و زاری

نگاہِ حسرت آلودِ عزیزاں کی سناں باری
فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی سنگ گراں بن کر حائل نہ ہو سکی، اس لیے کہ اسلام کا رشتہ دوسرے تمام رشتوں سے زوردار و مضبوط و مستحکم ہے، خون کے رشتے، فرزندوں کے رشتے، ربط و تعلق کے رشتے، عشق و محبت کے رشتے، رشتۂ اسلام کے سامنے مکڑی کے جالے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، چنانچہ جب اسلام نے پکارا تو یہ رشتے مزاحم نہ ہو سکے۔

مگر اک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں بااین گراں باری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری!
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمھیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری
تمھارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دین کی، کی ہے ناز برداری

اور ذرا یہ نقشہ ملاحظہ ہو:۔

تمھارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری
تمھیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خوں خواری

نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

یہاں تک خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے کے بعد اب شاعر ایک ایسا مرقع کھینچتا ہے، جو سننے والوں کی چشمِ تصور کے سامنے خلافت عثمانیہ کے مجاہدوں اور جاں نثاروں کے جذبۂ ایثار و قربانی اور ملت ترکیہ کی شان استقلال و عزیمت، اور پاسبانانِ حرم کی حمیت ملی اور غیرت قومی کو محسوس اور مرئی صورت میں پیش کر دیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں بیواؤں کی چشمِ اشک ریز، یتیموں کا چہرۂ یاس و الم، دشمنوں کی تدلیس و تخریب غداروں کی سازش اور شرارت، اپنوں کی جاں بازی اور بے پروائی، غیروں کی نمک پاشی اور تیر افگنی، فتح کی اور شکست کی، پسپائی بھی اور اقدام بھی، گردن کٹا دینے کا شوق بھی، اور گردن کاٹ لینے کا حوصلہ بھی، جان دے دینے کی تڑپ بھی، اور خون کا دریا بہا دینے کا جوش بھی، اسلام کی حرمت پر سب کچھ فنا کر دینے کی ہمت بھی، اور اسلام کے نام پر دنیا کی ہر طاقت سے بھڑ جانے کی جرأت بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بدترین حالات کا بہترین انداز میں مقابلہ کرنے کی سکت بھی، اب تک شاعر نے جو کچھ کہا تھا..... وہ شعر تھے، اور کوئی شبہ نہیں بہت اچھے شعر تھے، لیکن اب جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ شعر نہیں سحر ہے، ——— سحرِ حلال! ملاحظہ ہو ممبران وفد سے مخاطب ہو کر وہ کہتا ہے :-

مسلمانوں کے تم نے طالع و اژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلاب گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

یونان کی انسانیت سوز حرکتیں، برطانیہ کی غداری اور شیطانی ذہنیت، دول فرنگ کی مستعمرانہ پالیسی، یکہ و تنہا ترکوں کی قوت مدافعت و اقدام، ان سب چیزوں کو کس خوبی کس روانی اور کس فصاحت و بلاغت کے ساتھ، شاعر نے بیان کیا ہے، اور کہیں بھی حقیقت اور صداقت کا سر رشتہ چھوٹنے نہیں پایا ہے، ایک سچی اور مستند تاریخ کو شاعری کے قالب میں ڈھال لینا، فن اور ہنر کا بہت بڑا کمال ہے، ظلم ہوگا اگر اس کمال کا آپ نظارہ اور مشاہدہ نہ کریں!

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں:
مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈ اسٹوں بھی دیکھے ہیں

یادش بخیر یہ مسٹر گلیڈ اسٹون برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم تھے اور انھوں نے یہ بیڑا اٹھایا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے ڈھکیل کر پھر ان کے سابق وطن ایشیا میں پہنچا کر دم لیں گے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے صاف الفاظ میں، اپنی بے پناہ قوت و طاقت کے بل پر یہ اعلان بھی کر دیا تھا، اور آغا خاں جیسا شخص بھی اس قاہرانہ اعلان سے اتنا حواس باختہ ہوا تھا کہ اس نے ترکوں کو ایک پبلک بیان میں مشورہ دیا تھا کہ وہ یورپ سے بوریہ بستر باندھ کر رخصت ہو جائیں اور ایشیا میں زندگی کے دن بسر کریں آغا خاں کے اس اعلان پر سارے مسلم ہندوستان میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی، علامہ شبلی مرحوم نے اس سے متاثر ہو کر ایک معرکہ آرا نظم لکھی جو مولانا آزاد کے الہلال میں شائع ہوئی تھی، اس کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر اس باب کے آخر میں

اسے شامل کر دیا گیا ہے۔ شاعر آگے چل کر کہتا ہے :-

تمھیں نے غازیوں کے جسم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامہ پُر خوں بھی دیکھے ہیں
تمھاری چشم عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسار شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں
نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارض گلگوں بھی دیکھے ہیں
تمھیں سے کچھ پتا چلتا ہے شیدایانِ ملت کا
کہ تم نے شاہد اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنونِ جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں

اور شاعر یاس کی تاریکی میں آس کی کرن دیکھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے :

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

اور یہ سب کچھ کہہ چکنے، رونے اور رُلانے کے بعد، اس بوڑھے عالم اور شاعر کے لرزتے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہیں اور گریۂ گلوگیر کے ساتھ کہتا ہے

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی !
تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلیؔ نعمانی !

سر آغا خان کا خطاب ترکوں سے

جنگ بلقان کے زمانے میں سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں، تاکہ وہ دول یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں، اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غصہ پیدا ہوا تھا۔ اور ان کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا، ذیل میں اس کا طنزیہ جواب ہے:-

(۱)

گفت با ترک حضرتِ آغا — آنچہ گویم بگوش در گیرید
بگذارید خاک یورپ را — دل ازیں مرز بوم، بر گیرید
ایشیا مسکن قدیم شما است — باز آں خاک را مقر گیرید
دل بصید رمیدہ نتواں بست — یک شکار شکستہ پر گیرید
اسپ گر زیر راں نمی آید — بگذارید و عادہ خر گیرید
کار پیشینۂ شما کشت است — مرغزارے و گاؤ نر گیرید
بانگِ توپ تفنگ دردسر است — ناوک و خنجر و سپر گیرید
نوبت ریل و تلغراف گزشت — قاصد و پیک و نامہ بر گیرید

کار دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید، مختصر گیرید

(۲)

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتار الم
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے بڑے چین سے سوؤ گے چھ غم
نظر آجائے گی بے کاری آلاتِ جدید — جب کہ تم وادیٔ تاتار میں رکھو گے قدم

ریل یا تار کی پروا ہوگی نہ حاجت تم کو ‏ ‏ ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغانِ حرم
خود ہی کہہ دوگے کہ بیکار ہیں سب توپ و تفنگ ‏ ‏ نظر آئے گا جو تیر افگنیوں کا عالم
سلک بحری کی ادا دل سے اتر جائے گی ‏ ‏ دیکھ لوگے جو کمندوں کا وہ پیچ اور وہ خم
فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اٹھاؤ ‏ ‏ آپ کا اسپ سبک سیر ہے کس بات میں کم
آپ صحرا میں چلائیں گے جو خشکی کا جہاز ‏ ‏ پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے نہ طوفان کا غم
لطف جو بانگِ جرس میں ہے وہ سیٹی میں نہیں ‏ ‏ زین کو کہہ نہیں سکتا کوئی ہم پایۂ بم
لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز ‏ ‏ شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم
فیصلہ بیٹھ کے چوپال میں کر دے گا جو پنچ ‏ ‏ ہوگا یورپ کے قوانین سے بڑھ کر محکم
اور مانا بھی کہ فردوس بریں ہے یورپ ‏ ‏ حضرتِ خواجۂ شیراز یہ کرتے ہیں رقم

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم

یہ نظم کلیات شبلی میں شامل ہے -

مولانا ظفر علی خاں
اور
اُن کی ملّی شاعری

مولانا ظفر علی خاں، ریاست حیدرآباد میں ایک اچھے منصب پر مامور تھے، وہاں کے زیڈنٹ سر مائیکل روڈایر نے — جو بعد میں پنجاب کا لفٹیننٹ گورنر رہا — مولانا کی بعض سرگرمیوں کو مشتبہ نظر سے دیکھا، اور نظام کو مشورہ دیا کہ انھیں حیدرآباد سے رخصت کر دیا جائے، مولانا کا حیدرآباد سے اخراج عمل میں آیا لیکن وظیفہ حسنِ خدمت یعنی پنشن کے ساتھ وہ اپنے وطن کرم آباد تشریف لائے، زمینداران کے والد ایک ہفتہ وار کی حیثیت سے نکال رہے تھے، اب ان کا انتقال ہوا، تو مولانا نے اس کا بار ادارت اپنے دوشِ زبردست پر لے لیا، اور اسے کرم آباد سے لاہور لے آئے، اور اسے روزنامہ کر دیا، طرابلس اور پھر بلقان کی جنگ کے دوران میں زمیندار نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی، جنگ بلقان کے زمانے میں، مسٹر ایسکویتھ وزیر اعظم، اور مسٹر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ برطانیہ نے علی الاعلان یہ امید ظاہر کی کہ اب بلقان میں مسیحیت کے فروغ کا دور دورہ ہوگا اور اسلام وہاں سے خارج البلد کر دیا جائے گا، زمیندار کی پالیسی برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کی نہیں تھی، اس کی پیشانی پر واضح جلی الفاظ میں مرقوم تھا:

لیکن وزارت برطانیہ کے خلاف زمیندار نے جنگ شروع کردی، مولانا ظفر علی خاں صرف ایک انشا پرداز، اور صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے، بہت اچھے مقرر بھی تھے ۔ زمیندار کے اداریتی کالموں میں ان کے پرزور مضامین نکلنے لگے، ان کی برجستہ نظموں نے ایک نئی فضا پیدا کردی اور موچی دروازے کے باہر عوامی جلسوں میں انھوں نے جوش پیدا کرنے والی تقریروں کا بھی ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کردیا اور عین اس وقت جب ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو رہے تھے وہ چھپتے چھپاتے بمبئی گئے، اور وہاں سے قسطنطنیہ پہنچ گئے، خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں باریاب ہوئے اور ایک مرصع قصیدہ بھی خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا

پیام الفت از دہلی تا بہ استنبول آوردم
مثال بوئے گل ہستم کہ بر دوش صبا باشد
حذر اے دشمنانِ ملتِ بیضا ازاں ساعت
کہ در دستِ امیرما، لوائے مصطفیٰ باشد

کچھ روز تک ترکیہ میں قیام پذیر رہے، غازی انور پاشا، طلعت پاشا، اور دوسرے ترک مدبرین سے ذاتی روابط قائم کیے، پھر لندن پہنچے، وہاں ترکوں کی حمایت اور برطانوی پالیسی کی مخالفت میں متعدد تقریریں کیں، پھر مراجعت فرمائے وطن ہوئے، لندن سے روانہ ہونے سے پیشتر زمیندار کے لیے انھوں نے ایک مقالہ ارسال کیا تھا، جس میں لندن کی تصویر کھینچتے ہوئے فرمایا تھا:

چہار چیز است تحفۂ لندن
خمر، خنزیر، روزنامہ و زن

اب پنجاب کا لفٹیننٹ گورنر، حیدرآباد کا سابق ریزیڈنٹ سر مائیکل روڈایر تھا،

وہ پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اس نے اخبار سے ضمانت طلب کر لی۔

سر مائیکل روڈایر نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے:۔

"پان اسلام ازم کا ایک نقیب زمیندار بھی تھا، جس کا ایڈیٹر ایک آتش خو شخص ظفر علی خاں تھا، اس نے ۱۹۱۲ء میں ترکیہ کی انجمن ہلال احمر کے لیے چندہ جمع کیا، اور یہ رقم پیش کرنے خود قسطنطنیہ گیا، واپس آنے کے بعد اس کے انداز تحریر میں اور زیادہ تلخی پیدا ہو گئی، کئی بار تنبیہ کرنے کے بعد اس سے ضمانت طلبی کا حکم میں نے جاری کیا، لیکن اس کی روش نہیں بدلی، اس نے برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اسکویتھ کے خلاف سخت اور درشت لب و لہجے میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ضمانت ضبط کرنا پڑی، اور پریس بھی ضبط کر لیا گیا، اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی، لیکن وہ مسترد کر دی گئی اور حکومت کا فیصلہ بحال رہا!"

لیکن زمیندار کسی نہ کسی طرح جاری رہا، اور اپنی شعلہ نوائیوں کا سلسلہ اس نے جاری رکھا، اس نے حکومت برطانیہ اور وزرائے برطانیہ کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی تھی۔ وہ دونوں کو الگ الگ سمجھتا تھا، ایک کا وفادار تھا، دوسرے کا مخالف۔

جنگ طرابلس کے زمانے میں یعنی ۱۹۱۲ء میں مولانا نے ایک نظم "ہندوستان کے اسلامی جذبات" کے عنوان سے سپرد قلم کی، جس میں انھوں نے کہا تھا:

قدسیوں میں ہو رہی تھیں آج یہ سرگوشیاں
عن قریب اسلام کی فصلِ بہار آنے کو ہے
یار کے چہرے سے اٹھے گا کوئی دم میں نقاب
ہو گئیں جس کی نگاہیں دل کے پار آنے کو ہے

اگلے شعر میں اطالوی فوج کے کماندار کناوا کی سراسیمگی کا ذکر ہے، جو طرابلس میں انور پاشا کی آمد کی خبر سن کر اس پر طاری ہو گئی تھی، مولانا فرماتے ہیں :۔

آمد آمد سن کے انور کی کناوا نے کہا
کانپتے ہیں جس سے ہم وہ شہسوار آنے کو ہے

پھر فرماتے ہیں :۔

جمع ہونے کو صف اندر صف ہیں سنوسی جیوش
لشکرِ بربر قطار اندر قطار آنے کو ہے
اڑ گئے دُرنہ "و بن غازی" میں روما کے دھوئیں
حضرتِ پاپا کو شدت کا بخار آنے کو ہے
تازہ پھر ہونے کو ہے دار و رسن کی داستان
پھر انا الحق کی صدا مستانہ وار آنے کو ہے
بے کسوں کی آہ سے جو اٹھ رہی ہے پے بہ پے
گنبدِ گردونِ گرداں پر غبار آنے کو ہے
جوئے خوں بہنے لگی ہے دشت اور تبریز میں
سینٹ پیٹرسبرگ سے تہران میں زار آنے کو ہے

اشعار اچھے ہیں، ان میں روانی، سلاست، شگفتگی ہر چیز موجود ہے، لیکن ان میں وہ آہنگ، اور وہ روح نہیں ہے جو ابھی ہم شبلی کے شعروں میں دیکھ چکے ہیں، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اب تک وہ حکومتِ برطانیہ سے مایوس نہیں ہوئے تھے، اگرچہ وزرائے برطانیہ کے شاکی ضرور تھے۔ چنانچہ اسی نظم میں، جارج پنجم کا ذکر خیر بھی ہے اور بڑے شان دار الفاظ میں ارشاد ہوتا ہے :۔

جارج خامس جب چلے لندن سے ہم سب نے کہا
امن اور انصاف کا آئینہ دار آنے کو ہے
کیوں نہ چمکے آفتاب دولت و اقبال ہند
چل کر اس میں جب ہمارا شہریار آنے کو ہے
ابر نیساں بن کے برسے گا شہنشاہ کا کرم
تھا ہمیں مدت سے جس کا انتظار آنے کو ہے
آئے بھی، چل بھی دیے، دہلی سے لندن کو حضور
تجھ کو دولت، اپنے مرکز پر قرار آنے کو ہے

پھر زار روس، قیصر جرمنی، جوزف بادشاہ آسٹریلیا، اور وکٹر عمانوئیل شاہ اٹلی کا ذکر کرتے ہوئے شہنشاہ جارج پنجم کو یوں بڑھاتے ہیں :-

زار، قیصر، جوزف، اور وکٹر سے کیوں ملتے ہیں جارج
جا رہ مستوں میں کیوں اک ہوشیار آنے کو ہے

برطانوی حکومت سے اس والہانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ اسی شدت سے برطانوی وزرار کی استعماری پالیسی سے وہ نالاں تھے اور ترکوں کو مالی امداد دینے کے لیے بے قرار تھے، چنانچہ ایک دوست نے اپنے صاحبزادے کی شادی کے بعد ولیمے کی دعوت میں مولانا کو بھی مدعو کیا، مولانا نے اس کا منظوم جواب دیا۔ فرمایا:

اے شیخ جی یہ جشن مبارک ہو آپ کو
ہاں خوب دھوم دھام سے شادی منایئے
احباب کو بلایئے دعوت میں شوق سے
بسکٹ کھلایئے انھیں سوڈا پلایئے!
اللہ نے دیا ہے زر و مال آپ کو!!
اللہ کا یہ خیر میں بھی کچھ اٹھایئے!

درماندہ قوم کا رہے اس وقت کچھ خیال
بحرِ سخا کو جوش و تموّج میں لائیے
ارضِ طرابلس میں ہیں مسلم شکستہ حال
ان کی مدد کے واسطے توڑے دلائیے
آئے گا کام حشر کے دن سب لیا دیا!
دنیا میں دیجیے تو قیامت میں پائیے
اک کے عوض ملیں گے وہاں دس ضرور ہی
آسان یہ طریق ہے دولت بڑھائیے

۱۴ مئی ۱۹۱۲ء کو مولانا کی ایک دل چسپ، نتیجہ خیز اور معرکہ آرا نظم "حجّت منتظر کا انتظار" کے عنوان سے شائع ہوئی جو جذبات ملی کی آئینہ دار تھی :-

کسی نے تو ہتھیا لیا ہے مرا کو! — کوئی تاکتا ہے پڑا پرشیا کو!
جہاں میں حکومت ہے طاغوتیوں کی — بھلایا ہے بندوں نے اپنے خدا کو
نہ اپنے نہ اسلام کے کام آئی! — یہ شکوہ ہے جانِ حزیں سے قضا کو
گرے گی کوئی دم میں غیرت کی بجلی — وہ ٹھکرا رہے ہیں مری التجا کو
مسیحا سے جس کا لکھاتا ہوں نسخہ — نہیں درد پر کوئی حق اس دوا کو
مرا چارہ گر ہے پیمبرؐ عرب کا — وہ سرکار آئیں گے میری شفا کو
گداز اور رقت سے خالی ہوا دل — اثر رو رہا ہے ہماری دعا کو
عبث ناز کرتے ہیں ہم ابتدا پر — ہمیں دیکھنا چاہیئے انتہا کو

عمل گر یہی ہے تو ہم حشر کے دن
دکھائیں گے منہ جا کے کیا مصطفےٰؐ کو

سلسلۂ سخن طرازی و نکتہ سرائی جاری ہے، اور پھر اسی سلسلے میں کہتے ہیں :۔

ہے مسلم کے سینے میں یہ نور پنہاں — شرر راکھ میں جس طرح چھپ رہا ہو!
اگر راکھ ہٹ جائے پھر یہ شرارہ — زمانے کی مشعل کو آتش نما ہو
مگر شرطِ مشعل فروزی یہی ہے — کوئی حجّتِ منتظر روکشا ہو
کیا ہم سے جو وعدہ قرآں میں تو نے — بہت جلد وہ وعدہ یارب وفا ہو
کر انصاف تو ہی کہ کیا یہ رواہے — ذلیل اس طرح امّتِ مصطفےٰ ہو
معلّق ہو کوہِ غم اسلامیوں پر — مصیبت میں چھوٹا بڑا مبتلا ہو
برس جائے پھر تیری رحمت کا بادل — پھر اسلام کا باغ یارب ہرا ہو

ہے اس وقت منتظر گوشِ ملّت
کہ نقّارہ اسلام کا بج رہا ہو

ظفر علی خاں اب اسلام کے شاعر بنتے جا رہے تھے ان کے دل میں حکومتِ برطانیہ سے وفاداری اور شہنشاہ جارج پنجم سے عقیدت کے باوجود، آگ سلگنے لگی تھی، جس نے بعد میں انھیں بہت بڑا باغی اور انقلابی بنا دیا، اور جو حکومتِ برطانیہ کے استعماری مقاصد کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوئے، جس کی آتش نوائی اور سوختہ سامانی نے، مسلمانوں کی ہر تحریک میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، گو ابھی، بغاوت اور انقلاب کا یہ دور شروع نہیں ہوا تھا، لیکن اس کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے، اور :۔

"تم خیر خواہِ دولت برطانیہ رہو"

کی دعوت اپنے قارئین اخبار کو دینے والا صحافی، ایک ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو چکا تھا، اور بالآخر یہی ذہنی انقلاب، اس کی تاریخ حیات کا سب سے بڑا اور فیصلہ کن دور، یادگار انقلاب ثابت ہوا، اگرچہ طبعی سیماب وشی اس کے مراحل

میں وقفے کبھی کبھی، عارضی طور پر ڈالتی رہی۔

چنانچہ ۱۹۱۲ء میں، جب مولانا ترکی، اور یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے، تو راستے میں انھیں سسلی (صقلیہ) بھی دکھائی دیا، جس پر صدیوں مسلمانوں نے حکومت کی تھی، اور جہاں حکومت کے دوران میں انھوں نے پوپ سے جزیہ تک وصول کیا تھا، جس کی توثیق لیبان کی "تمدن عرب" اور "تاریخ صقلیہ" کے اوراق سے ہوسکتی ہے، یہ سسلی (صقلیہ) مسلمانوں کا ملک، یورپ کے دامن میں بن گیا تھا، یہاں عرب اور نومسلم یورپین آباد تھے، یہاں عالی شان مسجدیں تھیں، شان دار اور فلک شکوہ عمارتیں تھیں، مسلمانوں نے یہاں کی زراعت میں، حکومت میں نظم مملکت میں، تہذیب و تمدن میں، زبردست انقلابی تبدیلیاں کی تھیں، یہاں کی زبان اطالوی کے بجائے عربی ہوگئی تھی، صرف دفتروں میں سرکاری طور پر نہیں عوامی طور پر یہاں کے عام باشندے بھی عربی ہی بولتے تھے، فاطمی خلیفہ کا غلام "جوہر" جس نے مصر فتح کیا، قاہرہ کا شہر تعمیر کیا، اور جامع ازہر کی بنیاد ڈالی، یہیں کا رہنے والا ایک نومسلم تھا اقبال بھی اس راستے سے گزر چکے تھے، سسلی پر جب ان کی نظر پڑی تو ان کے جذبات بھی قابو میں نہ رہے، اور انھوں نے سسلی کا مرثیہ کچھ ایسے سوز و گداز کے ساتھ کہا جو تاریخ ادبیات اردو کا غیر فانی حصہ بن چکا ہے، ظفر علی خاں کے جذبات بھی اس موقعے پر قابو میں نہ رہے، انھوں نے ایک طویل نظم "سمندر کی روانی اور تخئیل کی جولانی" کے عنوان سے لکھی۔

سسلی کا ذکر بھی زبان پر آیا:-

ساحل، اٹلی کا ادھر، سسلی کے کنارے ادھر — وہ فضا سے ہم کلام، اور یہ صبا سے ہم کنار
ہیں مسلمانوں کے خوں میں پرورش پائے ہوئے — اس کی دل کش گھاٹیاں، اس کے دل آرا مرغزار

آہ وہ سسلی بسایا تھا جسے ہم نے کبھی — اندلس کی طرح مغرب میں ہماری یادگار
پرچم توحید اُڑا تھا جس کے ساحل پر کبھی — اور اذانوں سے کبھی گونجے تھے جس کے کوہسار

پھر کس حسرت کے ساتھ کہتے ہیں:

کیا نہ لہرائے گا پھر تجھ پر علم اسلام کا — اور نہ وہ وقت آئے گا جس کا ہے ہم کو انتظار
کیا نہ دیکھیں گی یہ آنکھیں تا پہنائے افق — تیری پہنائی میں ان جنگی جہازوں کی قطار
جن کے مستولوں کے اوپر اُڑ رہا ہوگا ہلال — با ہزاراں عز و تمکین و غرور و افتخار!
جن میں ہوگی ذات واحد کی عبادت صبح و شام — ہم سنیں گے جن سے پانچوں وقت اذانوں کی پکار

ایک ایک شعر، دل آویزی، اور تاثیر و اثر میں اپنی مثال آپ ہے، اگرچہ اس میں وہ تڑپ اور سوز نہیں جو اقبال کے مرثیہ سسلی میں ہے، اس کے مقابلہ میں اسے رکھیے تو آمد و آورد، کا فرق نمایاں ہو جائے گا، لیکن یہ آورد بہت جلد آمد بننے والی تھی، ذہن اور فکر میں جب انقلاب آتا ہے تو اس کے کچھ تدریجی مرحلے بھی ہوتے ہیں، اور ظفر علی خاں بھی ان مرحلوں سے گزر رہے تھے گزر نہیں چکے تھے، پھر بھی ان کے اندر جو روح ہے، وہ مستقبل کے طوفان کے غمّازی کر رہی ہے

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا

ہندوستان کے مسلمان اب بیدار ہو چکے تھے، وہ اپنے لیے بھی فکرمند تھے اور عالم اسلام کے لیے بھی۔ انھیں داخلی طور پر برطانوی حکومت کی ناانصافیوں سے شکایت تھی، عدم مساوات کی شکایت تھی، انھیں گلا تھا کہ ان کے حقوق پامال کیے جاتے ہیں، ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے، ان کی انفرادیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے، ہندو سامراج کے مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قومیت متحدہ کے بحر بے کراں کی ایک موج بن جائیں، اور برطانوی اغراض و مقاصد کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے "انا" کو ختم کر دیں، حکومت جو سلوک بھی ان کے ساتھ

روا رکھے وہ سجدے سے سر نہ اٹھائیں کہ عبودیت کی شان یہی ہے، اور ظاہر ہے وہ اس کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے۔

دوسری طرف عالم اسلام پے در پے ضربیں پڑ رہی تھیں، ترک ہدف ستم بنے ہوئے تھے، برطانیہ کو ان سے عداوت تھی، یونان ان کا دشمنِ جاں تھا، بلقان کی باج گزار اور مفتوح عیسائی ریاستیں یورپین حکومتوں کی شہ پاکر ترکوں کے خلاف میدان میں اتر آئی تھیں، اور یہ فرنگی حکومتیں علی الاعلان ان کی اخلاقی اور مادی مدد کر رہی تھیں، ان میں کچھ مسلمان بھی ایسے مل گئے تھے جو ان اغراض مشئومہ میں ان کا ساتھ دے رہے تھے، ملت سے غداری ان کا شیوہ بن چکا تھا، دین اور مذہب کی حیثیت ان کے نزدیک ثانوی تھی، اصل مقصد سرکار دولت مدار کے در دولت پر جبہ سائی تھی، اور اس فریضے کو یہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

نئی نسل اور ملی شعور کی بیداری

ان حالات میں نئی نسل سامنے آئی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مسجدوں اور خانقاہوں میں درس نہیں لیا تھا، انھوں نے علوم عصری کی تحصیل میں عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کر دیا تھا، تکمیل تعلیم کے لیے انھوں نے مصر اور حجاز کا رُخ نہیں کیا تھا، لندن کی درس گاہوں سے فیض حاصل کیا تھا، یہ میدان میں آئے اور ان کے آتے ہی حالات بدل گئے۔

اقبال نے لندن اور برلن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی، لیکن اس کی ملی شاعری نے، سارے ہندوستان میں شعور اسلامی کی ایک نئی زندگی پیدا کر دی، اس کا ایک ایک شعر تیر و نشتر کا کام کرتا تھا، محمد علی نے علی گڑھ اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی، پھر بڑودہ ریاست میں ایک بڑے منصب پر

مامور ہوگئے تھے، لیکن انھوں نے یہ سب کچھ چھوڑا، اور حکومت ہند کے دارالحکومت کلکتے سے کامریڈ نکال کر، ایک تہلکہ مچادیا، کامریڈ ہندوستان کی انگریزی صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا، اس کے اداریے، اس کے مقالے، احوال عالم پر اس کے تبصرے، اس کی طنزیات، اس کی نکتہ چینی اور تنقید اور سب سے بڑھ کر ترکوں کی حمایت میں اس کی شعلہ ریز تحریریں، یہ وہ چیزیں تھیں جنھوں نے نئی نسل میں، جسے نہ مذہب سے سروکار تھا، نہ ملت سے، دین اور ملت سے ربط و تعلق پیدا کردیا، عصبیت پیدا کردی، اپنے حقوق کے لیے اور عالم اسلام کے تحفظ و بقا کے لیے، لڑنے اور مرنے کا جذبہ پیدا کردیا، کامریڈ نے طبی مشن ترکی بھیج کر بہت بڑی انسانی خدمت انجام دی، ترکوں میں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں محبت اور مودّت کا ایسا رشتہ پیدا کیا جو دائمی بن گیا۔ اور جس کا نمونہ ہم گزشتہ سال کی جنگ بھارت و پاکستان میں دیکھ چکے ہیں، کامریڈ کے طبی مشن نے صرف زخمیوں کی مرہم پٹی نہیں کی، صرف زخموں پر مرہم نہیں رکھی صرف بیماروں کی تیمارداری نہیں کی، بلکہ ان ترک خانماں بربادوں اور خانہ بدوشوں کی ٹھوس خدمت بھی کی جو مہاجرت کے عالم میں اپنا سب کچھ کھوکر سب کچھ لٹاکر واپس آئے تھے، ایک غلام قوم نے ایک آزاد ملک سے اس طرح کا رابطہ پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تجربہ ناکام رہا۔

زمیندار کا شاندار کارنامہ

ظفر علی خاں، حیدرآباد میں ملازم تھے، اور اطمینان و آسائش کی زندگی بسر کررہے تھے لیکن ان کی آزاد روی، ان کے لیے مصائب کا پیش خیمہ بن گئی، وہ حیدرآباد سے رخصت کردیے گئے، وطن واپس آئے اور زمیندار کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی، وہی زمیندار جو ایک معمولی سا اخبار تھا ایک بلند پایہ روزنامہ بن گیا۔

ظفر علی خان کی نظموں نے، ان کے آتش ریز مقالات نے، تحریک اتحاد عالم اسلام کی تائید و حمایت نے، نہ صرف زمیندار کو ایک بلند مرتبت اخبار بنا دیا بلکہ پنجاب کے عوام میں زندہ رہنے کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا روح پرور جذبہ پیدا کر دیا، زمیندار کی خدمات، زمیندار کی قربانیاں، زمیندار کا اعلائے کلمۃ الحق تاریخ سیاست ملّی کا اتنا وقیع اور شاندار کارنامہ ہے جسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اس میں شبہ نہیں ظفر علی خاں نے سیمابی طبیعت پائی تھی اور اس سیماب وشی کے باعث، کبھی خود بھی نقصان اٹھاتے تھے، کبھی قوم کو بھی ہنگامے مصیبت کر دیتے تھے، لیکن مجموعی حیثیت سے انھوں نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، وہ نہ فراموش کیے جا سکتے ہیں، نہ نظر انداز کیے جا سکتے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کی بیداری میں ابوالکلام کا حصّہ

اور یہی زمانہ تھا، جب ابوالکلام آزاد کا الہلال افقِ صحافت سے طلوع ہوا۔

ابوالکلام نے نہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی، نہ ندوہ میں، نہ دیوبند میں کسی کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا، نہ فرنگی محل میں تکمیل کی تھی، نہ لندن گئے تھے، نہ امریکہ، نہ جرمنی، نہ فرانس، مصر کے جامع ازہر کے بھی طالب علم نہیں رہے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ اتنے بڑے عالم تھے کہ پایۂ اجتہاد رکھتے تھے، اتنے بڑے خطیب تھے کہ کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا، اتنے بڑے ادیب اور انشا پرداز تھے کہ ان کے خامۂ بہار آفریں سے پھولوں کی بارش ہوتی تھی، اور ان پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے تھے اتنے بڑے صحافی تھے کہ اردو میں اپنی طرز کا جیسا رفیع اور بدیع اخبار انھوں نے نکالا، آج تک ایسا اخبار نہیں نکل سکا، انھوں نے اپنی یہ تمام صلاحیتیں نئی نسل کو بیدار کرنے میں، اس میں فکرِ اسلامی پیدا کرنے میں اور اسے شعورِ ملّی سے آشنا کرنے میں صرف کر دیں

یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ انگریز سے بیزار اور کانگریس سے متنفر تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان کے دکھ کا مداوا نہ یہ تھا کہ وہ آستانۂ فرنگ پر سربسجود ہو جائے، نہ یہ تھا

کہ وہ کانگریس کی بزم انقلاب کا ایک ممبر بن جائے، ان کے نزدیک مرد مومن کی اس سے بڑی توہین نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی راہ عمل متعین کرنے کے لیے انگریز کی مدد، کانگریس کی سرپرستی، اور ہندو کی امداد کا طالب ہو، ان کی دعوت یہ تھی کہ مسلمان "خیر امت" ہیں، وہ اس لیے نہیں ہیں کہ دوسروں کو پیشوا بنائیں، اور خود ان کے مقتدی بن جائیں، اس لیے ہیں کہ ساری دنیا کی پیشوائی کریں، اور جملہ اقوام وملل عالم کو اپنا مقتدی بنالیں، وہ اگر انگریز کا ذکر نفرت سے کرتے تھے تو کانگریس کا ذکر حقارت سے کرتے تھے، وہ تو "حزب اللہ" کے داعی تھے، وہ اسلام کے نقیب تھے، ان کی پکار یہ تھی کہ تمام رشتے منقطع کرلو، اور صرف اسلام کے ہو رہو، ان کی زبان میں جادو تھا، ان کے قلم میں سحر تھا، ان کے بیان میں اعجاز تھا، ان کی خطابت میں الہام تھا، ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر بول، زور قلم سے لکھا ہوا ہر لفظ نوائے سروش معلوم ہوتا تھا۔

مسلمانوں کی حیات ملی کی تعمیر میں ان کا ناقابل فراموش حصہ ہے، ایمان کی اور سچی بات یہ ہے کہ گو بعد میں تینوں کی راہیں جدا جدا ہوگئیں، لیکن شروع میں، یعنی احیائے شعور ملی کی تحریک میں، اقبال، محمد علی اور ابوالکلام برابر کے شریک تھے، اگر یہ نہ ہوتے تو مسلمان ایک عرصۂ دراز تک تلاش راہ میں ٹھوکریں کھاتے رہتے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے اصولی معاملات میں سخت اور سنگین اختلافات کے باوجود ان کی عظمت کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں۔

طرابلس اور بلقان کی جنگ میں، اگر اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ کو زندۂ جاوید بنا دیا ـــــ فاطمہ تو آبروئے ملت مرحوم ہے، تو کامریڈ اور الہلال نے انور پاشا، رؤف بے وغیرہ کو ترکوں سے زیادہ ہندی مسلمانوں کا ہیرو بنا دیا، انور پاشا کے مجاہدات وفتوحات اور رؤف بے امیر البحر ترکیہ کے لازوال کارناموں کو

تاریخ کا ناقابلِ فراموش صفحہ، محمد علی کے کامریڈ اور ابوالکلام کے الہلال نے بنایا۔

قسطنطنیہ فتح کرنے سے پہلے ترکوں کا پایۂ تخت حکومت اور نہ تھا، جسے آج کل ایڈریانوپل کہتے ہیں۔

محاربات بلقان میں، جہاں ترک اپنے متعدد مقبوضات سے محروم ہوئے وہاں اور نہ سے بھی — عارضی طور پر — انھیں ہاتھ دھونے پڑے، یعنی یہ شہر مفتوح ہوگیا، اور دشمن نے اس پر قبضہ کرلیا۔

"یہ بہت بڑا حادثہ تھا!"

ترکوں کے لیے بھی، اور مسلمانانِ ہند کے لیے بھی۔

ترکوں کے لیے یوں کہ اس حادثے نے ان کا حوصلہ پست کر دیا، ان پر اضمحلال طاری ہوگیا، اور دول فرنگ نے یقین کرلیا کہ یورپ کا یہ مردِ بیمار اب لبِ گور پہنچ چکا ہے۔

اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یوں کہ وہ جس مسلم قوم کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے وہ شکستیں کھاتے کھاتے، اس اہم ترین علاقے سے بھی محروم ہوگئی تھی، اور اب مدعی سست، گواہ چست کا معاملہ تھا، ترکوں کی اس شکست نے مسلمانانِ ہند پر بھی غیر معمولی نفسیاتی اثر کیا تھا، وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے تھے، ان پر مایوسی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی، وہ نہ صرف ترکوں سے، نہ صرف اپنے آپ سے، بلکہ اسلام سے اور اس کی قوت سے بھی مایوس ہوگئے تھے۔

اس اہم ترین مرحلے پر، الہلال نے دو مقالات شائع کیے:!

یہ مقالات خاصے طویل ہیں، اور ان میں متعدد اور مختلف پہلوؤں پر، خطیبانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے، لیکن ان کے بعض خاص حصے، اگر قارئین کے

سامنے پیش نہ کیے جائیں تو ظلم ہوگا، ان سے اندازہ ہوگا کہ اس حادثے نے مایوسی، اور نا امیدی کی کیسی کیفیت طاری کر دی تھی، اور ان سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے، ان مایوس کن حالات کا مقابلہ کرنے کی دعوت کس انداز میں دی گئی، جس نے ٹوٹے ہوئے حوصلے میں ثبات و استقامت کی کیفیت پیدا کر دی۔

پہلے مقالے میں مولانا نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں لکھا :-

"ایڈریانوپل بالآخر مسخر ہوگیا مع جامع سلیم کی مقدس محرابوں کے، جنھوں نے دو صدیوں سے اپنے نیچے صرف سجدہ ہائے نیاز اور زمزمہ ہائے تکبیر و توحید ہی کو دیکھا تھا اور مع ان بلند اور عظیم ہیبت میناروں کے جن پر آج تک روزانہ اعلان شہادت توحید کی ایک صدا بھی قضا نہیں ہوئی تھی،— وہ فتح ہوگیا، حالانکہ ہمارے جوش و بیداری کا لشکر عظیم اب تک غفلت و سرشاری کے قلعے میں محصور ہے اور عبرت و تنبیہ کے پیہم ہجوم اب تک اسے مسخر نہیں کر سکے۔

اس خبر کی تصدیق کے بعد بھی دنیا ویسی ہی تھی، جیسی اس سے پہلے، میں نے دیکھا کہ ہم اپنے کاروبار میں مصروف اور اپنی اشیاجات میں بدستور منہمک ہیں، وقت پر کھانا کھاتے ہیں اور وقت پر نیند کے انتظار میں بستروں کو تلاش کرتے ہیں، زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی تغیر نہیں ہوا، اور اپنے اندر بھی دیکھا تو حالت ایسی ہی پائی جیسی کہ کل تک تھی، حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی، اس خبر کے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

میں نے سوچا کیا کسی دن اسی طرح قسطنطنیہ کے مسخر ہونے کی خبر بھی آجائے گی

قسطنطنیہ کیا شے ہے ؟ میں نے سوچا کہ ایک دن ہماری آخری متاعِ عزت یعنی بیت جلیل خلیل اللہ، اور مسجد مطہرۂ رسول اللہ پر بھی ملاعنہ صلیب کے حملہ آور ہونے کی خبر آ جائے گی اور ہم اسی طرح اپنی رفتارِ مدہوش میں آگے بڑھ جائیں گے ؟

غور کرو اب ہمارے لیے دنیا میں کیا کام رہ گیا ہے ؟

حکومتیں نہیں رہیں کہ ان کے دبدبہ و سطوت کا نقارہ بجائیں دولت و ثروت کب کی جا چکی، اور جو ہے وہ بھی برف آتش زدہ ہے، نئی زمینوں پر قبضہ کرنے کی فکر کیا کریں کہ جو چند گوشے اپنے ایام ذلت و نکبت بسر کرنے کے لیے رہ گئے تھے ان کے لائق بھی نہ نکلے، ہماری تمام متاعِ اقبال لٹ چکی ہے، ایوان حکومت کھنڈر بن چکے ہیں، اور تختِ شاہی الٹ گئے ہیں، اب ہمارے پاس کچھ باقی رہ گیا ہے تو بس یہی چند مسجدوں کی محرابیں، اور عبادت گاہوں کے صحن، اور یا پھر وہ گنبد سبز جس کے نیچے دنیا کا سب سے بڑا انسان سو رہا ہے۔

لیکن آج ایڈریانوپل کی جامع سلیم کے صحن میں بلغاریوں کے جوتوں کی گرد اڑ رہی ہے، کون کہہ سکتا ہے کل اور کیا کچھ نہ ہو گا ؟

پھر اے وہ لوگو کہ اپنے ایوان حکومت کی حفاظت نہ کر سکے کیا آج خدا کی عبادت گاہوں کی محرابوں اور اس کی صدائے توحید بلند کرنے والے میناروں کی حفاظت کر سکو گے ؟

ایران نے بابل کو مسمار کر دیا مگر آفتاب اسی وقت طلوع ہوا جیسا کہ روز ہوتا تھا۔ سکندر نے ایران میں آگ لگا دی، مگر

انسان نے اپنے گھروں کو، اور چڑیوں نے اپنے آشیانوں کو نہیں چھوڑا، بابل و نینوا کے عظیم الشان تمدن برباد ہو گئے مگر ان کی بربادی کے ماتم میں شاید کائنات کے ایک ذرّے نے بھی زحمت نہ اٹھائی یونان اور رومۃ الکبریٰ کے طلائی مندروں اور سنگی دارالعلوموں کی دیواریں سرنگوں تھیں اور اسکندریہ کے بیت العلم کا چراغ گل ہو گیا تھا، مگر عرب کے شتر سواروں نے کب اس کی پروا کی؟

ہماری ساری بدبختی اس میں ہے کہ ہم اپنی فتح و شکست کو ایڈریانوپل کے سامنے ڈھونڈھتے ہیں، حالانکہ اس کا اصلی میدان تو ہمارے دل کے اندر ہے، بس وقت آگیا ہے کہ جس کو اٹھنا ہے اٹھے، جس کو چلنا ہے چلے، اور جس کو اپنے روٹھے ہوئے خدا سے صلح کر لینی ہے کرلے کیونکہ ساعت آخری، نتائج سامنے، مہلت قلیل اور فرصت مفقود ہے۔

اگر ہم کو مٹنا ہی ہے تو اس کا کوئی شکوہ نہیں، رومۃ الکبریٰ اور بابل و نینوا کی عظیم الشان قومیں جہاں آباد تھیں وہاں آج خاک کے تودے اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے کھنڈر بھی سیاحوں کو بڑی مشکل سے ملتے ہیں، ہم نے تیرہ سو برس تک دنیا میں حکمرانی کی ہے اور مغرب و مشرق اگر ہمارے بعد ہم کو بھلانا چاہے تو مدتوں ہمارے افسانۂ حیات و ممات کو دہرا سکتا ہے، لیکن غم ہے تو اس کا کہ موت دونوں کو آتی ہے، سپاہی کو میدانِ جنگ میں، اور مجرم کو سولی کے تختے پر، پہلی عزت کی موت ہے جس پر ہزاروں زندگیاں قربان، اور دوسری ذلت کی موت ہے جس کے بعد کوئی اور ذلت

نہیں، اگر یورپ نے ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کاش ہمارے سینے پر گولی لگتی پر ہمارے گلے میں پھندا نہ ڈالا جاتا!"

"مسیحیت سے ہمارا معاملہ آج ہی سے شروع نہیں ہوتا بلکہ یہ میدان صدیوں سے گرم ہے، لیکن آج ہم کو سر جھکا کر اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس نے ہمیں پوری شکست دے دی، یہودیوں نے اس کے خدا پر "ولد الزنا" ہونے کی تہمت لگائی تھی، اور اس کی ماں کی عصمت پر بٹہ لگایا تھا ہم نے دنیا میں آتے ہی اس کو اس شرمناک ذلت سے نجات دلائی، ہم نے روز اوّل سے ان کے معبدوں اور گرجوں کی حفاظت کو اپنی مسجدوں کی حفاظت سے کم نہ سمجھا، اور ایک مرتد دمشق کی مسجد کی تعمیر شدہ زمین دے دی کہ اس پر گرجا بنایا جائے، لیکن آج طرابلس اور گیلی پولی کی مسجدوں کے محراب و منبر بھی صلیب پرستوں کے بوٹوں سے محفوظ نہیں ہیں، اور مشہد کی مسجد گوہر شاہ کا نصف گنبد توپوں کی گولہ باری سے گرا دیا گیا ہے ہم نے آٹھ سو برس تک اسپین میں عیسائیوں کو آستین میں بٹھا کر دودھ پلایا۔ انھوں نے صحن مسجد میں آکر پیغمبر اسلام کو گالیاں دیں مگر ہم نے ان کو ان کی سرزمین کی راحت سے محروم نہیں کیا، لیکن آج وہ ہم کو جلاوطن کرنے کی سازش میں فتح یاب ہو گئے ہیں، ہاں یہ سچ ہے کہ ہم نے بغداد کے دربار عظمت و جلال میں "سگ رومی" کے منہ پر تھوکا تھا، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ کہ ایک سو برس ادھر تک ترکی وزیر اعظم کی زبان میں روس اور آسٹریلیا کے بادشاہوں کو یاد کرنے کے لیے سب سے بڑی عزت یہ تھی کہ "وہ ہمارے اچھے کتے ہیں" لیکن پھر اس سے کیا ہوتا

ہے ؟ کیونکہ آج یورپ کا ہر مسیحی کتوں کو اپنی گود میں بٹھا کر پیار کرتا ہے لیکن ہمارے سروں کے لیے اس کے پاس سب سے بڑی عزت بوٹ کی ٹھوکر ہی ہے یقیناً ہم نے آٹھ صلیبی حملوں میں عیسائی کے سروں کو کچلا، اور یروشلم کے مقدس بیت اللحم پر ان کو قابض نہیں ہونے دیا، لیکن اس کا ذکر بھی اب بے فائدہ ہے کیونکہ آج تو وہ دن ہے کہ قریب ہے ہماری عزت وحیات کی آخری متاع یعنی مرقد مطہرۂ رسول اللہ اور بیت المقدس خلیل اللہ کی طرف بھی اس کی توپوں کے دہانے کھول دیے جائیں گے اور جدہ ینبوع کے ساحل پر یورپ کے آہن پوش ڈریڈ ناٹ لنگر انداز نظر آئیں گے۔

اگر آج حفظ کلمۂ توحید و بقائے بلاد مقدسہ و قیام ناموس شریعت اسلامیہ کی سب سے زیادہ ذمے داری ترکوں پر ہے کیونکہ ان کے ہاتھ میں تلوار ہے، تو یقین کیجیے مسلمانان ہند کی ذمے داری بھی کم نہیں ہے کیونکہ ان کی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں میں سب سے زیادہ ہے۔

پس اسلام کے مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے ضروری ہے کہ مسلمانان ہند اس میں اپنا پورا حصہ لیں، اور ایک لمحے کے لیے بھی اس وسوسۂ ابلیس سے فریب نہ کھائیں کہ وہ بالکل بے دست وپا ہیں، اور کچھ کر نہیں سکتے۔

یقیناً تم کچھ کر نہیں سکتے اگر سمجھتے ہو کہ کر نہیں سکو گے۔ دنیا میں ہمیشہ دو ہی خیال دماغوں میں پیدا ہوئے ہیں، بعضوں نے سمجھا کہ کچھ نہیں کر سکیں گے اور بعضوں نے خیال کیا کہ اگر کرنا چاہیں گے تو

سب کچھ کرلیں گے، پہلے خیال کا نتیجہ یہی نکلا کہ کچھ نہ ہوا، لیکن دوسرے خیال نے چٹیل میدانوں کو ایوان و محل، ویران جنگلوں کو آباد و شاداب کر دیا، البتہ استقامت شرطِ راہ ہے۔"

ذرا غور کیجیے آج سے ۵۵ سال پہلے، اس آہنگ خطابت نے، برطانوی استعمار اور غلام آباد ہندوستان کے ذہن و دماغ پر کیا اثر کیا ہوگا؟

میں نے اس باب کے شروع میں عرض کیا تھا کہ مسلمانوں پر بھی مایوسی، نومیدی اور اضمحلال کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اور عین اس وقت ۹ اپریل ۱۹۱۳ء کے الہلال میں ایک قیامت کا مقالہ نکلا، جس نے مایوسی کی جگہ عزم و ثبات پیدا کر دیا۔ اس کے بعض حصے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے قارئین کرام کو روشناس کرانا ضروری ہے:-

"جنگ بلقان یا جنگ فرنگ و اسلام کی تاریخ اگر لکھی جائے گی تو اس میں شاید سب سے زیادہ موثر اور دردانگیز باب مسلمانان عالم کے اضطراب کا ہوگا، یہ سچ ہے کہ میدان جنگ میں صرف ترک مجاہدین تھے، جن کی لاشیں دشمن کی گولیوں سے تڑپتی تھیں، لیکن دنیا میں کروڑوں ایسے انسان بھی تھے جن کی لاشیں نہیں، مگر پہلو میں دل تڑپتے رہتے تھے۔

میں دیکھتا ہوں کہ ایڈریانوپل کے سقوط کی خبر نے ابنائے ملت کی ہمتوں کو پست کر دیا ہے، یاس و اضطراب کا لشکر جب آتا ہے تو اس کا پہلا حملہ عقل و دماغ پر ہوتا ہے، لوگ حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ اور مایوس ہیں کہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم نے بڑے بڑے آتش کدوں اور تنوروں کو دیکھا ہے کہ ان کے اندر سے آگ کے مہیب شعلے اٹھ رہے ہیں، حالانکہ چند گھنٹے پیشتر

ان کی تہہ میں چند بجھی ہوئی چنگاریوں کے سوا کچھ نہ تھا، انہی خاکستر کے تودوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو جب باد تند و تیز کے جھونکے میسر آگئے تو چشم زدن میں دہکتے ہوئے انگاروں اور اچھلتے ہوئے شعلوں سے تنور بھر گیا، پھر کیا عجب ہے کہ سوز و تپش کی جو چنگاریاں۔ اس وقت دلوں میں بجھی ہوئی نظر آرہی ہیں توفیقِ الٰہی کی بادِ شعلہ افروز انہی سے اس آتش کدۂ حیات کو گرم کردے،

جس طرف دیکھتا ہوں سقوط ایڈریانوپل کے واقعے پر یاس و قنوط کے جذبات کو احاطہ کیے ہوئے پاتا ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ اب کیا باقی رہ گیا ہے جس کے لیے امید کی جائے؟ اور بدقسمتی نے کیا چھوڑا ہے جو ہمتوں میں مستعدی پیدا کرے؟ اب یا تو ماتم کی صفیں بچھائیے یا سیلاب بدبختی کی رَو پر اپنے تئیں چھوڑ دیجیے کہ جب ڈوبنا ہی ہے تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے کیا فائدہ ہے

حیران ہوں کہ آج مسلمان مایوس ہو رہے ہیں، حالانکہ میں تو مایوسی کے تصور سے کانپ جاتا ہوں، کیونکہ مایوس ہونا خدا کی جناب میں نسلِ آدم کی سب سے بڑی شوخ چشمی ہے، وہ کون سا کاہن ابلیس ہے جس نے خدا کے خزانۂ رحمت کو دیکھ کر تمھیں بتایا ہے کہ اب اس میں تمھارے لیے کچھ نہیں ہے؟

قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل امید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے، وہ دنیا کو ایک کارگاہ عمل سمجھتے ہیں جو کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمھارے ہی لیے ہے، نامرادی دلوں کو محروم کرتی ہے پر مایوس نہیں کرتی، کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری ہی

تلوار اور دشمن کی گردن ہو؟ کیوں نہ ہم اپنے سر اور سینے پر بھی زخم کے نشان پائیں؟ شکست و زخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو، اور تلووں کو بچانا چاہتے ہو تو تمھارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے چلوگے تو ٹھوکر کھاؤگے، اور لڑوگے تو زخم سے چارہ نہیں،

میں نہیں سمجھتا کہ اگر موجودہ جنگ میں ہر طرف نتیجہ شکست ہی رہا تو اس سے فرزندانِ اسلام مایوس کیوں ہو جائیں اگر ایڈریانوپل چھ مہینے کی عدیم النظیر مدافعت اور محیر العقول مقابلے کے بعد بالآخر قدرتی اسباب و حالات کی بنا پر مفتوح ہو گیا تو پھر چالیس کروڑ فرزندانِ اسلام کی حصن امید لشکر مایوسی سے کیوں مفتوح ہو جائے۔

ایک لاکھ سے زیادہ سردی بلغاری لشکر توپوں کے دہانے کھول کر اگر ایڈریانوپل کی مٹی کی دیواریں ڈھا دیتا ہے تو یہ کون سا دنیا کا نیا اور عجیب واقعہ ہے؟ اس میں اس قوم کے لیے کون سی شرم کی بات ہے جس نے سترہ ہزار فوج کے ساتھ ایک بے پناہ اور مٹی کی دیواروں سے بنے ہوئے مقام میں چھ مہینے تک مدافعت کی ہو؟

پھر اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اب ترکوں کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا؟ تو خدا کے لیے جواب دو کیا تمھارے خدا کی قوت کا بھی خاتمہ ہو گیا؟ مان لو کہ ترکوں کی تلوار زنگ آلود ہو گئی، اور اب ٹوٹ کر ان کے ہاتھ سے گر گئی ہے لیکن کس کو معلوم ہے کہ ابھی خدائے لازوال اور کتنی غیر مستعمل تلواریں چمکا سکتا ہے؟ اسلام ایک قوتِ الٰہیہ ہے جس کی زندگی انسانوں اور قوموں سے وابستہ نہیں، بلکہ قوموں کی زندگی اس کی متابعت سے

وابستہ ہے قومیں گر سکتی ہیں۔ اور انسانوں کے خاکی جسم مٹ سکتے ہیں، پر وہ نہیں مٹ سکتا وہ اپنے خدائے لازوال کی غیر فانی قوت کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، کیونکہ وہ صداقت ہے اور صداقت کب نہ تھی اور کب نہ رہے گی؟

اسلام کا ظہور ترکوں کے ساتھ نہیں ہوا ہے بلکہ ترکوں نے اس کے دم سے اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہے کیا تیرہ سو برس پہلے جب غارِ حرا سے حق کی روشنی چمکی تو اس وقت ترکوں کا ہاتھ اس کا محافظ تھا؟ کیا بدر اور حنین کے میدانوں میں ترک تھے جن میں سے تین سو فاقہ مستوں نے تین ہزار جوانانِ عرب کو خاک و خون میں ملا دیا تھا؟ کیا یرموک اور قادسیہ کے معرکہ ہائے خونیں میں وہ ترک ہی تھے جنھوں نے رومیوں اور ایرانیوں کی ہزاروں لاشوں سے صحرائے شام و مدائن کو بھر دیا تھا؟ وہ قوم جس نے تختِ کسریٰ کی ہزار ہا سالہ عظمت کا خاتمہ کر دیا ترکوں کی تو نہ تھی وہ جس نے سپہ سالارِ روم کے سامنے اپنے نیزے کو ریشمی قالین کے اندر سے زمین میں چبھو دیا تھا یقیناً کوئی ترک تو نہ تھا۔

اگر یہ سچ ہے کہ تمھارے دل بھی مایوس ہو گئے ہیں اور تمھارے دل میں خدائے ابراہیمؑ و محمدؐ نے جو چراغ روشن کیا تھا بجھ گیا ہے تو اس میں شک نہیں کہ تم مر گئے، تم جو کبھی نہیں مر سکتے تھے، یقیناً مر گئے۔ پس جس قدر ماتم کرنا ہے کر لو اور جس قدر جلد اپنی قبر کھود سکتے ہو کھود لو، کیونکہ خدا کی رحمت صرف امید رکھنے والوں کے لیے ہے، خدا تم کو نہیں چھوڑتا تم اسے چھوڑ رہے ہو، وہ تمھاری طرف دیکھتا ہے لیکن تم نے مایوس ہو کر اس سے منہ موڑ لیا ہے، تم کو نہیں معلوم یہی، مایوسی ہے جس کو تمھارے خدا نے کفر کی خودکشی سے تعبیر کیا ہے:۔"

مولانا حسرت موہانی کی مجاہدانہ زندگی

(۱)

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک کے سیاسی اضطرابات اور حالات پر قدرے تفصیل سے گفتگو گزشتہ ابواب میں ہو چکی ہے، لیکن اس دور کی تاریخ نامکمل رہے گی، اگر بطلِ جلیل، اور مجاہدِ راہِ استقلال و عزیمت مولانا حسرت موہانی کا ذکر نہ کیا جائے۔

مجموعۂ اوصاف حسرت موہانی متضاد اوصاف و صفات کا مجموعہ تھے۔ ان کی انتہا یہ تھی کہ مومن مخلص ہونے کے باوجود، کٹر کمیونسٹ بھی تھے اور آغاز یوں ہوا کہ جب حکومت کی وفاداری شرط ایمان تھی اور اس عقیدے میں ہندو مسلمان دونوں متحد تھے انھوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ دہشت پسندوں کا ساتھ دیا، اور برطانوی شہنشاہیت پر ضرب کاری لگانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ادبی و شعری سرگرمیاں بھی جاری رکھیں، مزارات پر حاضری، اور عرسوں میں شرکت کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی میں بھی فرق نہ پڑا۔

علی گڑھ میں حسرت موہانی کا دور محمد علی سے مقدم تھا، اپنی ایک تحریر میں۔

مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی ۔ انھوں نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے اور علی گڑھ کے ان مشاعروں کا لطف لے لے کر ذکر کیا ہے، جو انجمن "اردوئے معلیٰ" کی طرف سے ہر چاند کے مہینے کی چودھویں تاریخ کو زیر سایۂ ماہتاب عالم تاب منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان شعری مجلسوں کی روح رواں حسرت موہانی کی ذات تھی۔ جنھیں بے تکلف دوست "خالہ جان" کہا کرتے تھے، اس مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے محمد علی نے یہ شعر بھی لکھا ہے۔ جس کا ایک مصرع یاد ہے: ؎

لطفِ مشاعرہ تو گیا چاندنی کے ساتھ

بی، اے کرنے کے بعد حسرت موہانی بہ آسانی، سرکاری ملازم ہو سکتے تھے علی گڑھ پر حکومت مہربان تھی۔ جن طلبا، کی سفارش پرنسپل کر دیتا تھا وہ کسی اچھے سرکاری عہدے کے لیے نامزد کر دیئے جایا کرتے تھے، لیکن حسرت موہانی کو یہ راستہ پسند نہیں آیا۔ انھوں نے "اردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کر دیا جس میں ادبی نکات بھی ہوتے تھے، قدیم شعراء کا انتخاب کلام بھی اور تصحیح و مقابلے کے بعد قدیم مخطوطات شعری کی اشاعت بھی، جس محنت اور جوش و خروش سے یہ کام کرتے تھے۔ اسی خلوص اور صداقت کے ساتھ، سیاسیات حاضرہ اور ملکی مسائل پر اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ علی گڑھ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز، انھوں نے صرف اس لیے بنایا تھا کہ انھیں اپنی مادر علمی کے بام و در سے والہانہ محبت تھی اور اپنا جذبۂ دروں، اپنے قافلے میں لٹا دینے کے لیے بے چین تھے۔

برطانیہ کے دامِ ستم میں مصر کو اسیر ہوئے ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی اور وہاں کے باشندوں پر ہولناک مظالم کا سلسلہ جاری تھا، ایک صاحب نے مصر میں برطانوی سیاست پر، ایک سیر حاصل مضمون لکھا، اور برطانوی آمریت قہرمانیت، اور استبداد کا چہرۂ زشت بے نقاب کر دیا لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہ

تھی کہ اپنے نام سے مضمون شائع کراتے، حسرت نے گمنام مضمون شائع کر دیا۔ حکومت ایک عرصے سے تاک میں تھی، اس نے حسرت کو گرفتار کرلیا، حسرت اگر مضمون نگار کا نام ظاہر کر دیتے تو بچ جاتے، لیکن انھوں نے جیل جانا گوارا کرلیا مگر مضمون نگار کا نام ظاہر نہیں کیا، یہ حسرت کی اخلاقی جرأت کا ثبوت تھا۔

اور یہ اخلاقی جرأت حسرت میں کچھ غیر متوقع بھی نہیں تھی، جو شخص ۱۹۰۴ء میں اپنی قوم کے مزاج اور رجحان کے بالکل برعکس آزادیِ ہند کا پرچم لے کر کانگریس میں شریک ہونے کی جرأت رکھتا ہو اور جو کانگریس کی نرم روی، نیازمندی اور حصولِ جاہ کے عام مظاہرے دیکھ کر کانگریس کے بائیں بازو کا رکن رکین بن گیا ہو، جس کی قیادت تلک کر رہے تھے، وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا؟

سامراج دشمن میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ حسرت مومنِ خالص ہونے کے باوجود کٹر کمیونسٹ بھی تھے۔ کمیونزم کا اصول انھیں کچھ ایسا بھایا تھا کہ وہ کمیونزم کے غیر واقعی، اور واقعی، پہلوؤں اور اس کی بے دینی بلکہ مذہب دشمنی کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ذاتی طور پر راسخ العقیدہ مسلمان، اجتماعی طور پر کمیونسٹ، اسی طرح جب وہ کانگریس میں شریک ہوئے اور بائیں بازو کے زعیم کبیر مسٹر بال گنگا دھر تلک کے پیرو بنے تو انھوں نے بالکل فراموش کر دیا کہ یہ سیواجی کا پرستار، یہ مسلمانوں کا بدترین دشمن، یہ گنپتی تہوار کا موجد، یہ پونہ اور بمبئی کے ہندو مسلم فسادات کا بانی، یہ بدترین اور سخت ترین فرقہ پرست، اپنا دامن بے گناہوں کے خون سے رنگین کر چکا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ انھیں صرف اتنا یاد تھا اور اسی کو وہ حرزِ جان بنائے ہوئے تھے۔ کہ یہ شخص برطانوی سامراج بہادر کا دلیر دشمن بھی تھا، اور اس دشمنی میں کانگریس کے دوسرے لیڈروں کی بہ نسبت زیادہ سے زیادہ دور تک جانے کی ہمت و جرأت

رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ تلک کے ساتھ نہایت ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ نباہتے رہے۔

۱۹۰۷ء میں کانگریس کا جو اجلاس بہ مقام سورت افراتفری اور ہنگامہ آرائی کے ساتھ آئندہ کے لیے ملتوی ہوگیا تھا۔ وہ مسٹر تلک ہی کی کرشمہ سازی تھی، کانگریس ان کی انتہا پسندی کا ساتھ نہیں دے سکی۔ تلک صاحب نے کانگریس کا تختہ ایک سال کے لیے الٹ دیا۔ اس معرکہ آرائی میں حسرت موہانی اپنے سیاسی گروہ کے ساتھ تھے۔ سورت گئے اور پٹ کر واپس آئے، لیکن شان فاتحانہ تھی۔

پھر جب بنگال کو لارڈ کرزن نے تقسیم کر کے مشرقی بنگال کا ایک مسلم اکثریت والا جداگانہ صوبہ قائم کیا، تو ہندو اکثریت تلملا اٹھی سارے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ کانگریس نے غیر فرقہ پرست جماعت ہونے کے باوجود تقسیم کی سخت و شدید مخالفت کی اور بنگال کے ہندو نوجوانوں نے دہشت پسندی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بم پھینکے، قاتلانہ حملے انگریزوں پر کیے، عمارتیں ڈھائیں، آگ لگائی اور بدیشی یعنی برطانوی مال کے "بائیکاٹ" کی تحریک، تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے کے لیے شروع کی تو، حسرت نے ہندو بنگال کی مسلم دشمنی اور مسلم آزاری اور تنگ نظری کو یکسر فراموش کر کے جو چیز مضبوطی سے پکڑ لی وہ تھی "سدیشی" کی ترویج انھوں نے اپنے چھوٹے سے گھر میں ایک کھدر بھنڈار بھی کھول لیا۔

شبلی کی تحسین

اب وہ اردوئے معلیٰ کے بالغ نظر اور نکتہ سنج مدیر بھی تھے، ایک ابھرتے ہوئے سیاست داں بھی اور سدیشی کے مبلغ بھی، ان کی یہی ادا دیکھ کر مولانا شبلی ــ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے ــ بے ساختہ کہہ اٹھے:۔

"تم آدمی ہو یا جن؟ پہلے شاعر تھے۔ پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنیے بن گئے"

اردوئے معلّیٰ پریس سے ضمانت طلبی

حسرت کی ان سرگرمیوں کا انعام وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں حکومت کی طرف سے ملتا رہا، ایک انعام یہ بھی تھا کہ یوپی کے لفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن کی حکومت نے اردوئے معلّیٰ پریس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کرلی۔

یہ ضمانت مولانا ابوالکلام سے نہیں طلب کی گئی تھی کہ عقیدت مند تھیلیاں لے کر آگے بڑھتے اور رقم جمع کر دیتے، مولانا محمد علی سے بھی طلب نہیں کی گئی تھی کہ وہ اپنا باغ فروخت کرتے اور ضمانت کی رقم جمع کر کے کلمۂ حق بلند کرتے رہتے تھے، مولانا ظفر علی خاں سے نہیں طلب کی گئی تھی کہ وہ ایک تہلکہ خیز اپیل لکھ کر قارئین و ہمدرد ان زمیندار میں ایسا جوش اور ولولہ پیدا کر دیتے کہ مطلوبہ رقم سے زیادہ رقم فراہم ہو جاتی، یہ ضمانت طلب کی گئی تھی ایک فقیر بوریہ نشین اور درویش فاقہ کش سے جس کے حامیوں، ہمدردوں اور دوستوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور جس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کے لیے اور تو اور علی گڑھ کالج کے اصحاب اقتدار و اختیار کمر کس کر میدان میں آچکے تھے۔ اور جس کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ جیل گیا، تباہی سے دوچار ہوا، لیکن کسی سے ایک پیسے کا طالب نہیں ہوا۔ کسی نے کچھ دینا چاہا تو شانِ استغنا سے انکار کر دیا، جو اپنی اور اپنی بے سہارا بیوی بچی کی تن پروری اور شکم سیری کے لیے کسی کے سامنے دست طلب دراز نہ کر سکا، وہ بھلا اپنا پریس جاری رکھنے کے لیے کسی کے سامنے سائل بن کر کس طرح آسکتا تھا۔

الہلال کا شذرہ

مولانا ابوالکلام نے اس واقعے سے متاثر ہو کر الہلال میں جو کچھ لکھا وہ حقیقت کی ایک جیتی جاگتی کہانی ہے۔

مولانا نے تحریر فرمایا :-

" تین ہزار روپے کی ضمانت پریس ایکٹ کی مقدار مقررہ انتہائی کے اندر ضرور ہے۔ لیکن عملاً پانچسو یا ہزار روپے سے زیادہ طلب نہیں کی جاتی۔ اور صرف ایک دو مثالیں دو ہزار کی سنی گئی ہیں۔ پھر ہز آنر سر جیمس مسٹن بالقابہ کا دربار سطوت و جلال نہیں معلوم اتنی بڑی سنگین رقم ضمانت کے لیے کیا وجہ بیان کر سکتا ہے۔؟"

گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اردو پریس (مولانا حسرت کے پریس کا نام ہے) اور اس کے مالک کی حالت کیا ہے۔ حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کر آئے تو کوئی چیز ایسی اس دنیا میں باقی نہ تھی جو ان کے لیے ذریعۂ تقویت مال ہوتی، ڈیڑھ دو روپے ماہوار کرائے کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی، اور ایک کوٹھری ہے اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے، اندر وہ فقیر حریت اپنی کوہ عزم و ثبات بیوی کے ساتھ خود رہتا ہے اور باہر کانٹھ کا ایک دیسی پریس ہے اور دو چار پتھر ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اردوئے معلیٰ کی کاپیاں لکھی ہیں، خود ہی پتھر پر جمائی ہیں اور خود ہی پریس چلا کر چھاپا ہے۔

یہ کل کائنات اردو پریس اور اس کے مالک کی ہے، کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں۔ اور نہ اس کی طبع غیور کسی کی شرمندۂ احسان ہونا پسند کرتی۔ اردوئے معلیٰ کے دو چار سو خریدار ہیں، اس کی قسمت سے شاید چند روپے مہینے میں بچ رہتے ہیں اور اسی سے دو وقت کی روٹی کھا کر نشۂ آزادی کی بے خودی، اور دولت حق و صداقت کے غنائے غیر فانی سے مست رہتا ہے : ؎

مبین حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند !

اصلی دولت دل کی دولت ہے، اور غنا و فقر کے آگے دنیا کے تمام ساز و سامان ہیچ ہیں، جو فقر و فلاکت کی زندگی حق و حریت کی معیت میں گرد خاک پر بسر ہو وہ چاندی سونے کے بنے ہوئے ان ایوان تعیش سے ہزار درجہ بہتر ہے جن کے اندر حق کے چراغ کی روشنی نہ ہو، خدا کے دروازے کا فقیر ہونا دولت و بندگانِ دولت کے فقیر ہونے سے کیا بہتر نہیں؟ یہی تو اس راہ کے منازل امتحان ہیں۔

ان حالات کے ساتھ ایک ایسے شخص سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کرنا یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جو برٹش انڈیا کی تاریخ میں گورنمنٹ کے اظہار سطوت و جلال کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا!

حسرت کی عدیم المثال قربانی، استقامت اور عزیمت کا ایک کرشمہ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ خراج تحسین بھی ہے ورنہ معاصرین کے بارے میں، عام اس سے کہ وہ ہندو زعما ہوں، یا مسلم رہنما وہ بہت اختصار کے ساتھ چند الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیا کرتے تھے۔

مشاہداتِ زنداں

حسرت موہانی جس زمانے میں جیل بھیجے گئے اس وقت تک سیاسی قیدیوں کے لیے درجہ بندی نہیں ہوئی تھی۔ نہ انھیں کسی قسم کی مراعات حاصل تھیں۔ اخلاقی قیدیوں کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارنا پڑتے تھے، وہی لباس، وہی کھانا، وہی طرز ماندوبود۔

حکومت کی ستم رانیوں اور جیل کی زندگی سے متعلق حسرت نے رہائی کے بعد اردوئے معلیٰ میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جو بعد میں "مشاہداتِ زنداں" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا۔ یہ بڑے لرزہ خیز حوادث پر مشتمل ہے۔ اس کے بین السطور سے حسرت کے رجحان طبع کا بھی خوب

اندازہ ہو جاتا ہے، نا مناسب نہ ہو گا اگر اس قیمتی اور نادر دستاویز کے چند اجزا ذیل میں پیش کر دیے جائیں۔

مولانا اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو مقدمۂ سڈیشن (بغاوت) قائم ہوا۔ اور ۴ اگست کو ۲ سال قید سخت اور پانچ سو جرمانے کا حکم سنایا گیا۔

علی گڑھ میں ہر شخص جانتا ہے اور اسی لیے مجسٹریٹ علی گڑھ کو بھی اس کا علم ہو گا کہ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے، اس پر بھی پانچ سو روپے جرمانہ کرنے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اردوئے معلیٰ اور کتب خانۂ اردوئے معلیٰ کی بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہے۔ پولٹیکل مقدمات میں ملزم فرنگیوں اور فرنگی حکومت کا دشمن سمجھا جاتا ہے اس لحاظ سے یورپین مجسٹریٹ کے دل میں بغض و کدورت کا پیدا ہونا ایک ایسا قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم اس کو الزام نہیں دے سکتے۔

بیگم حسرت موہانی کا حیرت انگیز کردار

گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیر خوار بچی نعیمہ صد درجہ علیل تھی۔ اتفاق سے وہاں پر والدہ نعیمہ کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بر بنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا مظاہرہ ہوا۔ خود پریشان ہونے اور راقم کو مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ

کارپردازانِ زنداں متحیّر رہ گئے۔

راقم کا دل بفضلہ، امرِ حق کی پیروی کے باعث یوں ہی قوی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ:۔

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو، میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو!"

تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ وہ جیل میں بھی مجھ سے ملنے آئیں، اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتے آیا کیں اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آیا!"

بیگم حسرت موہانی کا ذکر حسرت نے جس انداز میں کیا ہے وہ شاعرانہ مبالغے سے یکسر خالی ہے، تمام تر حقیقت پر مبنی ہے، اپنے شوہر کی طرح وہ بھی اپنے فکر و عمل میں بڑی سخت تھیں۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھیں، انھوں نے پردہ اس وقت توڑا جب مسلم معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پردہ توڑنے کے باوجود اسلامی اقدار پر زندگی کی آخری سانس تک عامل رہیں۔

ایک یادگار واقعہ بیگم حسرت موہانی کی دلیری اور بے باکی کا ایک واقعہ مجھے بھی یاد آگیا۔ ۱۹۲۶ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بہ مقام کان پور منعقد ہوا۔ صدرِ اجلاس تھیں مسز سروجنی نائڈو، جواہر لال کو لیڈروں کی صف میں محمد علی اپنا سکریٹری بنا کر لا چکے تھے، لیکن ابھی وہ جوان تھے، اور نوجوانوں ہی کی قیادت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کانگریس پنڈال کا اور کانگریس نگر کا انتظام و انصرام نیشنل والینٹر کور کے سپرد ہوا۔ جس کے سربراہ جواہر لال تھے

کانگریس کا اجلاس شروع ہوا تو حسرت موہانی اور ارجن لال سیٹھی نے،

مندوب نہ ہونے کے باوجود، مزدوروں کی ترجمانی کے لیے کانگریس کے پنڈال میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ داخل ہونا چاہا، بیگم حسرت موہانی بھی ساتھ تھیں رضا کاروں نے آگے بڑھ کر ان ناخواندہ مہمانوں کا راستہ روک لیا۔ اب بیگم حسرت موہانی آگے بڑھیں۔ انھیں روکنے کی ہمت رضا کاروں میں سے کسی ایک میں نہ تھی۔ فوراً جواہر لال کو اطلاع دی گئی۔ وہ ایک خوبصورت سے سفید گھوڑے پر سوار سارے پنڈال کا گشت کر رہے تھے، ایڑ لگائی اور فوراً موقع واردات پر آموجود ہوئے، اور بیگم صاحبہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"یہ مندوبین کا اجلاس ہے، کوئی غیر مندوب داخل نہیں ہو سکتا۔"

بیگم صاحبہ نے حسرت صاحب کے ہاتھ سے ان کی چھڑی چھینی اور کس کر، جو اس اسپ صبا رفتار اور جواہر لال پر جمائی تو دونوں کو چوکڑی بھولنے کے بجائے چھٹی کا یاد آگئی گھوڑا پہلے الف ہوا، پھر پے در پے وار نہ سہ سکا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا، جواہر لال گرے تو نہیں لیکن گرتے گرتے بچے۔ بس اتنا موقع کافی تھا۔ آگے آگے بیگم حسرت موہانی، پھر حسرت موہانی، ارجن لال سیٹھی، اور پورا مجمع، کس میں ہمت تھی کہ اس ریلے کو روک سکتا، یہ سیل بلا جو آگے بڑھا تو پنڈال میں جا کر دم لیا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، جو زبان قلم پر بے ساختہ آگیا، آپ تو حسرت کی داستان سنیے

"قواعد جیل کی رو سے حوالاتیوں سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا لیکن ہم نے جب دیکھا کسی کو گھاس چھیلتے کسی کو جھاڑو دیتے یا پانی بھرتے میں پایا۔ کیونکہ ان خدمات سے انکار کا نتیجہ زدوکوب کی ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوت محض اس لیے مقدمے قائم کیے تھے، کہ انھیں سزا نہ بھی ہوگی تو کم از کم حوالات میں رہ کر اُن کی

آبرو خاک میں مل جائے گی "

اب حوالاتی داخل زنداں ہوتا ہے۔

جیل کی زندگی "۴ اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز اس طرح ہوا، کہ کچہری سے جیل جاتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا، ایک کرتہ اور ٹوپی پہننے کے لیے ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اور اوڑھنے کے لیے اور ایک قدح آہنی (لوہے کا پیالہ) بڑا اور چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کے لیے مرحمت ہوا۔ بہت جلد طبیعت نے قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں کہ ان کے لیے اغیار کی بندگی اور غلامی تک قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔

زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی۔ البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنگی فریضۂ نماز ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ مجبوری اور بے کسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا راقم نے اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

الہ آباد جیل میں تبدیلی: عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا۔ چنانچہ جب ۱۳ اگست کو تبادلۂ الہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو اس خیال کو اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ وہاں پریس کی موجودگی سے کوئی لکھنے پڑھنے کی خدمت لی جائے گی۔

لیکن راقم کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی امید نہ تھی۔ چنانچہ الہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کار تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد رہی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا، حالانکہ تمام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی!"

علی گڑھ سے الہ آباد کی طرف پابجولاں قیدی روانہ ہوتا ہے

"الہ آباد روانگی کے لیے دو پولیس مینوں کے ہمراہ پابجولاں اسٹیشن تک بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی ٹرین کا وقت قریب تھا لیکن سلاخ دار بیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی کچھ دور بمشکل پا پیادہ چلنے کے بعد ملازمان پولیس نے حسب معمول، از روئے قانون بے گار ایک یکہ گرفتار کیا۔ اور ہم سب اس پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچے، گورنمنٹ نے ہمارے اخراجات سفر کے لیے کرایہ ریل کے سوا ایک پیسہ زائد نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ رستے میں، قیدیوں کی خوراک کے لیے ایک آنہ فی کس فی روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنے کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ دو چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو منظور نہیں کیا۔ اور وہ ناکام واپس گئے۔ والد مرحوم کو میرے اس طرح گرفتار مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا۔ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی ٹھیک نہیں رہی۔ اور آخر کار میری عدم موجودگی ہی میں انھوں نے انتقال فرمایا جیل میں مجھ کو

اس واقعے کی خبر تک نہیں ہوئی!"

نینی جیل الہ آباد کا سنٹرل جیل ہے۔ یہاں حسرت کے قیام کے بارہ سال بعد موتی لال، رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد خاں شیروانی، جواہر لال، مسز وجے لکشمی پنڈت کملا نہرو، اندرا نہرو، مالوی جی اور نہرو خاندان کے دوسرے لوگ شاہانہ جاہ و حشم کے ساتھ قید کی معیاد بسر کرتے رہے۔ لیکن یہاں کا پہلا سیاسی قیدی حسرت موہانی کس طرح دن گزارتا رہا۔ اسی کی زبان سے سنیئے۔

"صبح آٹھ بجے کے قریب سنٹرل جیل (نینی) میں داخل ہوئے علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لیے گئے۔ اور کہا گیا یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے۔ اس وقت تک کالے کپڑے پہنو جن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف، غلیظ اور بدبودار کپڑوں کا تصور انسانی ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک کی اجازت دے دی تھی، لیکن الہ آباد والوں نے عینک کو داخل دفتر کرکے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا، تھوڑی دیر بعد جیلر صاحب نازل ہوئے۔ اور میرے ساتھ کے تمام کاغذوں کو اپنے سامنے جلوا کر خاکستر کر دیا۔ اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔ دفتر میں مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا۔ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیج جاؤ گے۔ اور وہاں مار کر خاک کر دیے جاؤ گے!"

نینی جیل کے مشاہدات

اب یہ خطرناک قیدی نینی جیل کی اس بارک میں پہنچایا جاتا ہے جہاں برق انداز ڈاکٹر بڑا سفاک قسم کا آدمی ہے تاکہ اس کے دماغ کی گرمی نکال دے۔ قیدی کا بیان ہے:

"دن کو ڈاکٹر کے خوف سے کوئی بول نہ سکتا تھا لیکن رات کو جب سب سو جاتے تھے تو ضلع شاہجہاں پور کے پنڈت تلک رام پہرے والے ہر گشت میں کچھ دیر میرے قریب ٹھیر کر ضرور مصروف گفتگو ہوتے تھے، تھوڑی ہی دیر کی گفتگو میں انھوں نے کل معاملات کو بخوبی سمجھ لیا کہ اخبار کسے کہتے ہیں اور ایڈیشن کس شے کا نام ہے؟ سدیشی اور بائیکاٹ سے پہلے ہی واقف تھے۔ ایک دوسرے بزرگ تلک سنگھ ۲۶ سال سے جیل میں سکونت رکھتے ہیں۔ درمیان میں کئی بار رہا ہوئے لیکن اس مرتبہ چند ہی ماہ کے بعد دوبارہ کسی جرم کی علت میں خوشی خوشی اپنے مسکن (جیل) میں داخل ہو گئے، جیل میں آگ جلانے یا حقہ پینے کی سخت ممانعت ہے لیکن تلک سنگھ اعلانیہ آگ جلا کر حقہ پیتے تھے۔ جیل کی کوئی سزا ایسی نہیں ہے جو ان کو نہ ملی ہو۔ بیڑیاں ان کے پڑی تھیں، کوٹھری میں یہ بند رہے تھے، کپڑوں کے عوض ٹاٹ انھیں پہننے کو ملا تھا۔ لیکن اسے بھی انھوں نے جلا دیا تھا۔ اس لیے ایک لنگوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ان کے جسم پر نہ تھا۔ ٹاٹ کا بستر توڑ توڑ کر انھوں نے حقہ پی ڈالا تھا۔ اور ان تمام بدعتوں کے بعد بھی اس درجہ بے باک تھے کہ جب کبھی جیلر یا کسی دوسرے افسر کا ان کی جانب گزر ہوتا تو اس سے تیل اور گڑ کی فرمائش ضرور کرتے تھے!"

علی گڑھ کا گریجویٹ اردوئے معلیٰ کا مدیر شہیر آل انڈیا کانگریس کا سرگرم کارکن سدیشی تحریک کا مبلغ خانوادۂ سادات کا گل سرسبد جیل میں ان لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے!

جیل میں رمضان دن گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بھئی ماہ مبارک رمضان

بھی آگیا۔ حسرت کا بیان ہے :۔

" ہماری بیرک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً سب نے روزے رکھنے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہو کر کھانا کھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جس سے بے سر و سامانی کی حالت میں بھی شانِ مساوات و اخوت، سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہوتی تھی، جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ڈاکٹر کے دل نے بھی قبول کیا، چنانچہ ایک روز مجھ سے بلا تقریب مخاطب ہو کر بولے :۔

" بھائی صاحب میری جانب سے سختی کا خوف دل سے نکال دیں، مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجیے گا۔! "

داستان ابھی ختم نہیں ہوئی :

" جن لوگوں کی مشقت چکی خانے میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی کیونکہ جلد جلد پانی پینا چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے، علاوہ بریں بے کھائے پیے ایک من گیہوں پیسنا یوں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا، رحمتِ الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا، کیونکہ لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ ان میں دس دس بیس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی پیے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح کر لیتے ہیں ؟ "

الغرض ایک ایک کر کے ماہ رمضان بھی ختم ہونے کو آیا اور آخری

جمعہ کو نماز (با جماعت) ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم الحروف نے زبانی خطبہ دیا اور اسی وقت۔ کے لکھے ہوئے چند الوداعی اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی۔!"

نینی سنٹرل جیل کے چند اور مشاہدات و تاثرات:

"الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے۔ راقم الحروف کے حال پر حکامِ جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ تقریباً تمام مدتِ قید اسی مشقت میں بسر ہوئی، قاعدے کی رو سے فی قیدی پندرہ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو تیس سیر غلہ پیسنا چاہیئے، لیکن الہ آباد میں تیس سیر کے بجائے چالیس سیر پسواتے ہیں۔ جس کے عوض میں ہر سہ ماہی پر دو یا تین دن رہائی کے دیئے جاتے ہیں بشرطیکہ اس عرصے میں کوئی قصور ایسا سرزد نہ ہو جائے جس سے پیشی کی نوبت آجائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

قیدی جب کوئی جرم کرتا ہے تو وارڈر اسے سزا کے لیے سپرنٹنڈنٹ کے روبرو پیش کرتا ہے۔ اسی کا اصطلاحی نام پیشی ہے، اگر چالیس سیر سے ایک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی، اگر آٹا ذرا بھی موٹا رہ جائے تو پیشی، اگر آٹے میں ذرا بھی مٹی یا پانی ملانے کا شبہ ہو تو پیشی،

مٹی یا پانی ملانے کا معاملہ اس طور پر ہے کہ بعض قید کچا غلہ چبانے پر ناکافی خوراک کے سبب مجبور ہوتے ہیں اور بعد میں آٹا پورا کرنے کے لیے گیہوں میں مٹی اور چاول میں پانی ملا دیتے ہیں، جو لوگ نہیں کھاتے انھیں بھی کچھ نہ کچھ ملانا ضرور پڑتا ہے، ظاہر ہے آٹا پیسنے کے دوران میں کچھ تو چکی میں رہ جاتا ہے، کچھ اڑ کر ہوا میں مل جاتا ہے۔ کچھ پیسنے والوں کے

بدن پر پسینے کے ساتھ جم جاتا ہے، داروغہ صاحب اعلانیہ فرماتے تھے جو چاہو کرو، ہم کو آٹا پورا دو ورنہ ہم پیشی کر دیں گے،

ایک روز ایک قیدی کی برق انداز سے کچھ حجت ہو گئی اس نے وفعدار کو بلایا اور کہا کہ برق انداز پانی ملواتا ہے قسمت کی خوبی دیکھیے کہ سب سے پہلی چکی میری ہی تھی، جس کے پاس ہی میرا ساتھی بقدر ضرورت یعنی قریب آدھا پاؤ کے پانی ملا رہا تھا۔ مجھ کو اس واقعے کی خبر نہ تھی کیونکہ عام طور پر میں روزانہ غلہ پیسنے کے بعد چکیوں کی جانب پشت کرکے لیٹ رہا کرتا تھا، ہنگامہ برپا ہونے پر میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرا ساتھی گرفتار رہے، اگر اس کے پاس یا میرے پاس کچھ پیسے وفعدار کو دینے کے لیے ہوتے تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا، لیکن چونکہ ہم دونوں نادار تھے، اس لیے پیشی ہوئی اور کچھ غلہ کھا جانے کے الزام میں تین دن کی رہائی ضبط ہو گئی، سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مسکراہٹ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ انھیں میری نسبت غلہ کھانے کا گمان نہیں ہے، لیکن اصول جیل کے مطابق کسی ماتحت کے پیش کرنے پر سزا کا دینا لازمی تھا، ورنہ اس کی سبکی ہوتی۔

میرے متعلق پیشی کا یہ دوسرا واقعہ تھا، پہلا واقعہ اس سے بھی زیادہ دل چسپ ہے، چکیاں اس قدر وزنی ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو اوپر کا پاٹ اٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے، اس لیے دو شخص ایک چکی پر آمنے سامنے کھڑے ہو کر پیستے ہیں، اور اگر برابر پیسے جائیں تو صبح چھ بجے سے لے کر سہ پہر کے تین بجے تک غلہ پس جاتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں پیسنے والے برابر زور لگائیں۔

میری نسبت وارڈر کو یہ گمان تھا کہ اس سے چکی نہ پس سکے گی۔ لیکن جب دوسرے دن معلوم ہوا کہ میں نے اپنا کام وقت مقررہ سے پہلے ختم کر دیا تھا تو اسے یقین نہ آیا، چنانچہ تیسرے دن اس نے مجھے سب سے خراب چکی دی، اور میرے جوڑی دار کو سمجھا دیا کہ تم ڈھیل دے دینا تمھیں ہم پیشی پر نہیں بھیجیں گے، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دس سیر غلہ باقی رہ گیا، قاعدے کے مطابق ہم دونوں کی پیشی ہونی چاہیئے تھی، لیکن حسب قرارداد سابق صرف میری پیشی ہوئی اور دو دن کے لیے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی سزا تجویز ہوئی میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے سب حال کہہ دوں، لیکن برق انداز کو پیٹی اتار کر زد و کوب پر آمادہ دیکھ کر میں نے خاموشی اختیار کی، اور معاملے کو خدا کے سپرد کیا۔!"

حسرت کی اس حیات زنداں کا بعد کے زندانیوں سے موازنہ کیجیے تو محسوس ہوگا، حسرت نے ملک کی آزادی اور استقلال کے لیے جو ستم سہے اور سختیاں برداشت کیں اس میں کوئی ان کا حریف نہیں، میں نے ملت، مذہب اور قوم کے بجائے عمداً ملک لفظ استعمال کیا ہے حسرت کی سیاسی زندگی کا آغاز حب وطن ہی سے ہوا تھا۔ اس وقت تک ملت، دین اور قوم کے لیے نہ انھوں نے کسی قربانی کا مظاہرہ کیا تھا، نہ کسی تحریک میں شریک ہوئے تھے، وہ قومیت متحدہ کے قائل تھے، اور انھوں نے جس مرشد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ نہ صرف یہ کہ ہندو تھا بلکہ کٹر فرقہ پرست اور مسلم دشمن ہندو تھا، میری مراد مسٹر بال گنگا دھر تلک سے ہے،! مسلمان تو مسلمان، ہندوؤں میں بھی ملک کے لیے اس قربانی کا مظاہرہ کرنے والے شاذونادر تھے، اور گاندھی جی، موتی لال، پٹیل وغیرہ تو ابھی کتم عدم

سے عالم وجود میں بھی نہیں آئے تھے ۔!

مشاہدات زنداں کا ایک اور صفحہ

"میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کردی تھی کہ کاغذ، قلم، پنسل، کتاب یا اخبار تک اس شخص کی کسی طرح دسترس نہ ہوسکے، اس سختی کے سبب چکی پیسنے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں اکثر کئی کئی دن تک یہ کوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا، ان غزلوں کے جمع ہونے اور بہ حفاظت جیل سے باہر پہنچانے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔

راقم الحروف کے زمانے میں تقریباً تمام ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کردی گئیں، لیکن یہ کم ترین جہاں تھا، وہیں رہا ایک بار جیلر نے میرے لیے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی، اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے آگاہ کیا۔ داخلۂ جیل سے قبل راقم الحروف کا وزن ۱۳۲ پونڈ تھا، لیکن اب صرف ۱۰۸ پونڈ باقی رہ گیا تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قساوت قلبی نے میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔"

جیل کے لرزہ خیز واقعات کا ایک اور دل گداز مرقع

ہر روز صبح کو سب قیدی جانگیا، تسلا، کرتا، کٹھری، چکی خانے کے باہر پیڈ میں لگا کر صف باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لے کر وفعدار باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے۔ کھانے کے وقت دروازہ پھر کھولا جاتا ہے، اس سے قبل اگر کسی کو

رفع حاجت کے لیے دروازہ کھولنے کی تکلیف دفعدار کو دینا پڑے
تو اس تکلیف دہی کا عوض اکثر ڈنڈوں اور سونٹوں کی شکل میں ملتا
ہے، کئی قیدیوں کو تو اس جرم میں اتنی سزا ملی کہ عرصے تک ان کے اعضا
مجروح رہے، ہمارے سامنے اسماعیل قیدی کو بے رحم داروغہ نے
اس قدر مارا کہ اس کا تمام جسم زخمی ہوگیا اور پھر الٹی سپرنٹنڈنٹ سے
شکایت کرکے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوادیں، قصور اس کا صرف
اتنا تھا کہ ہاتھ میں ضرب آجانے کے سبب اس نے چکی پیسنے سے معذوری
ظاہر کی تھی!۔"

حسرت کی حیات زنداں تاریخ سیاست ہند کا ایک نہایت اہم باب ہے،
اسے لاکھ مختصر کیا جائے مگر اہم ترین اجزا، اس داستان کے چھوڑے نہیں جا سکتے،
انھیں دوسرے باب میں ہم پیش کریں گے!۔

حسرت کی حیاتِ زنداں کا ایک اور ورق

(۲)

چلے تم کہاں ؟ میں نے تو دم لیا ہے
فسانہ دلِ زار کا کہتے کہتے!

حسرت کی داستان زنداں کی کچھ کڑیاں پیش کی جا چکی ہیں، کچھ اب پیش کی جا رہی ہیں۔ جیل میں اس مردِ غیور کے ساتھ برطانوی سامراج کے اہل کاروں کا کیا سلوک تھا؟ اسی کی زبان سے سنیے!

"جب کبھی گودام میں آٹا زیادہ جمع ہو جاتا تو دو ایک روز کے لیے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیے جاتے، زیادہ تر انھیں کٹنگ کی مشین پر کپڑا صاف کرنے یا بنولے صاف کرنے کی خدمت ملتی لیکن راقم الحروف اس عارضی تکلیف سے بھی محروم رہا، جب کبھی ایسا موقع ہوتا تو وارڈر مجھ کو کام پر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے ہی میں بند کر دیتا۔ اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی"

جیل کے مکینوں کو فریاد کی اجازت بھی نہ تھی۔ ع

گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

حسرت صاحب فرماتے ہیں :۔

سپرنٹنڈنٹ جیل تک کسی کی رسائی نہیں ہوتی یا اگر پریڈ وغیرہ کے موقعے پر کچھ کہنے سننے کا موقع ملتا ہے تو نائب جیلر کی غضب آلود نگاہ کے اثر سے عذر کرنے والے کے ہوش وحواس ابتدا ہی میں غائب ہو جاتے ہیں اس پر بھی اگر کسی نے کچھ عرض کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر اس کا مطلب انگریزی میں نائب جیلر سے دریافت کرتے ہیں جو قیدی کی شکایت کو اپنی تشریحوں اور توجیہوں کے ساتھ ملا کر اس شکل میں پیش کرتا ہے کہ اکثر غریب کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں ۔ مثلاً الہ آباد کے سجان نے عذر کیا کہ میرے ہاتھ کا گٹا اترا ہوا ہے ۔ اس لیے مجھے آسان کام دیا جائے ، نائب جیلر نے اپنی جانب سے اتنا اور بڑھا دیا کہ میرے خیال میں یہ شخص بہانہ کرتا ہے ، نتیجہ یہ ہوا کہ چکی خانے سے اس کی مشقت تو تبدیل نہیں ہوئی البتہ ایک ماہ کے لیے اس کے پیروں میں بیڑیاں اور ڈال دی گئیں ۔

چیری ضلع الہ آباد کے خلیل کی انگلی کٹنگ مشین میں کسی طرح کٹ گئی نائب جیلر نے یہ بات جڑ دی کہ اس نے کام سے جان بچانے کے لیے اپنا ہاتھ خود زخمی کر لیا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے معیادی بیڑیوں کے علاوہ تین مہینے کی چکی ان کے نام لکھ دی گئی ، بے چارے ایک ہاتھ سے چکی پیستے تھے اور نائب جیلر کی جان کو روتے تھے ، طرفہ تر یہ کہ کوئی شخص بطور خود اپنا حال سپرنٹنڈنٹ سے انگریزی میں نہیں عرض کر سکتا تھا کیونکہ انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرنا گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے ۔ میں نے ایک بار بہ حالت ناواقفیت کچھ بات انگریزی میں کرنا چاہی تھی کہ ایک

ہندوستانی وارڈر اسی کے اشارے سے مجھ پر حملہ آور ہوا!"

کتب خانے کی بربادی

جرمانے کی سزا بھی قید کے ساتھ ساتھ حسرت کو ملی تھی، وہ جرمانہ کہاں سے ادا کرتے؟ وہ بھی پانچ سو؟ اس رقم کے وصول کرنے کے لیے حکومت نے کیا کیا؟ سنیے:-

"اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان دردناک ہے، جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں سے بہم پہنچایا تھا، جن میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی تھی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان ٹھیلوں میں بھر بھر کر اس طرح لے گئے جیسے لوگ لکڑی یا بھس لے جاتے ہیں، ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ زرجرمانہ کے عوض میں اردوئے معلیٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت کسی طرح تین چار ہزار روپے سے کم نہ تھی، صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا"

"مشاہدات زنداں" میں حسرت نے اپنے جیل کے ساتھیوں کی مرقع کشی بھی کی ہے، چند کے چہرے آپ بھی دیکھ لیجیے:

"عبداللہ غازی آبادی اپنے گھی کے روزگار کی ایسی ایسی حیرت انگیز حکایتیں بیان کرتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کے پاس ایک دیگچی اور اس کے ساتھ کوئی شے اس قسم کی تھی جس کے اثر سے وہ خریدتے وقت ۵ سیر کے بجائے بہ آسانی سوا چھ

سیر گھی بغیر کسی ظاہری فریب کے لے سکتے تھے اس میں ہاتھ کی صفائی کو مطلق دخل نہ تھا، کیونکہ خود تولتے بھی نہ تھے، بلکہ بیچنے والوں ہی سے تلواتے تھے، پھر جب خود فروخت کرتے تھے تو چھ سیر کی جگہ پانچ سیر اسی ترکیب سے دے دیتے تھے۔

ملوک پور ضلع بارہ بنکی کے گرچرن کرلی پائن دین (ڈاکو) کے مشہور گروہ سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کی بہادری کے اکثر قصے سنایا کرتے تھے۔

منشی نول بہاری سے غلہ گودام کا کچا چٹھا معلوم ہوا کرتا تھا۔ جس کے ظاہر کرنے کی ہم میں ہمت نہیں ہے۔

کوڑہ جہاں آباد کے ایک قیدی بہاری نے نازک موقعوں پر میری مدد کی، مثلاً جس روز نائب جیلر نے چکی خانے کی تلاشی لی ہے اس وقت ان کا سارا شبہ میری جانب تھا کہ یہی کچھ نہ کچھ لکھا کرتا ہے اتفاق سے ایک غزل کا مسودہ میری ٹوپی میں تھا، اور میں پریشان تھا کہ کیا کروں؟ بہاری نے مجھ سے فوراً پوچھا، کہ آپ کے پاس کوئی کاغذ تو نہیں ہے؟ اگر ہو تو مجھے دے دیجیے، میں اسے چھپاؤں گا۔ اگر میرے پاس نکل بھی آیا تو آپ کے عوض میں سزا برداشت کرنے کو راضی ہوں، غرض کہ وہ پرزہ اس نے لے کر معلوم نہیں کہاں غائب کیا کہ برہنہ تلاشی لیے جانے پر بھی دست یاب نہ ہوا۔

لیکن نائب جیلر کے جانے کے بعد پھر کہیں سے نکال کر مجھ کو دے دیا۔

جیلر برق انداز قوم کا پاسی الہ آباد کا باشندہ تھا، جیسا شریفانہ سلوک جیلر نے میرے ساتھ کیا اس پر نظر کر کے میں اکثر خیال کرتا تھا

کہ طینت کی نیکی اور بدی کو ذات پات کی قیدوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا
مولوی اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو پڑھ پڑھ کر اس نے اردو
میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اکثر آموختہ مجھ کو سنایا کرتا اور
فارسی عربی الفاظ کے معنیٰ مجھ سے دریافت کرتا تھا "

جیل میں کالے گورے کا امتیاز بھی شدت کے ساتھ بلکہ ڈھٹائی کے ساتھ ملحوظ رکھا جاتا تھا، حسرت نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے، کہتے ہیں :

" کالوں کے لیے صبح کو آدھا پاؤ چنے بطور ناشتہ دیے جانے کا حکم ہے، لیکن عموماً چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے، کھانے میں جوار، باجرہ، ماش، اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ہوتی ہیں۔ جس میں گیہوں کی مقدار سے کچھ ہی کم مٹی یا چونا ملا ہوتا ہے جیل کی سخت مشقت سے مٹی تو کیا کنکر پتھر بھی ہضم ہو جائیں۔ پکی روٹی نو چھٹانک ملنے کا حکم ہے، لیکن عموماً آٹھ چھٹانک بلکہ کبھی سات چھٹانک سے بھی کم ملتی ہے، معلوم نہیں آٹا جو اس طرح بچتا ہے کہاں جاتا ہے ؟

روٹی کے ساتھ دوپہر کو ابلی ہوئی بے دلی ارہر کی دال بے روغن و مرچ ملتی ہے۔ اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ پھینک دیے جانے پر کوّے بھی اسے نہیں سونگھتے۔

برخلاف اس کے گوروں کو ناشتے کے لیے ڈبل روٹی، چائے، شکر اور کھانے کے لیے گھی، گوشت، ترکاری، چاول، دودھ، غرض کہ سب کچھ ملتا ہے، اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔

کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ، ایک جانگیہ، ایک کرتا، ایک ٹاٹ،

ایک کمبل، ایک ٹوپی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ برخلاف اس کے گوروں کو بوٹ کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں، پہننے کے لیے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لیے علیحدہ ہندوستانی قیدی دھوبی کا کام کرتے ہیں، لیٹنے کے لیے مسہری اس پر گدا اور چادر غرضیکہ آرام کی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔

کالوں کے لیے بارکیں ہیں جن میں برابر برابر مٹی کے ڈھولے یا اولٹے (چبوترے) بنے ہوتے ہیں، جاڑا گرمی، برسات ہر موسم میں انہی پر سونا چاہیے، سخت گرمی کے دنوں میں کاغذ وغیرہ کا مصنوعی پنکھا رکھنا بھی ممنوع ہے، برخلاف اس کے گوروں کے لیے فی کس ایک کمرہ علیحدہ ملتا ہے جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار، ایک میز ایک اسٹول ایک لیمپ اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور پائخانہ موجود ہوتا ہے۔ غسل خانے میں تولیہ، صابن، ہر شے موجود رہتی ہے۔

رات کو لیمپ کی روشنی میں اور دن کو فرصت کے اوقات میں گورے قیدی کتابیں اور کبھی کبھی اخبار بلا تکلف دیکھتے ہیں، ان کے لکھنے کو دوات قلم ہر وقت موجود رہتا ہے، حالانکہ کالوں کے لیے کتابیں دیکھنا تو درکنار اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو تو قیامت آجائے۔

سب سے بڑا تماشا یہ ہے کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندوستانی قیدی رات بھر پنکھا قلی کا کام کرتے ہیں بارہ بجے تک ایک اور پھر صبح تک دوسرا قیدی پنکھا کھینچا کرتا ہے۔

گوروں کے لیے ہر ہفتے میں ایک یا دو بار پادری صاحب آکے وعظ فرماتے ہیں۔ اور ایک جگہ عبادت کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن کالوں کی مذہبی ضروریات کی جانب کبھی بھول کر بھی توجہ نہیں کی جاتی، تمام قیدیوں کی پوشاک میں جانگیا کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ جسم سفل ران تک بالکل کھلا رہتا ہے اور اس طرح پر نماز کے لیے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی، یہ کمی ایسی ہے کہ صرف دو بالشت کپڑا زیادہ استعمال کرنے سے رفع ہو سکتی ہے۔ راقم الحروف مجبوراً اسی حالت نیم برہنگی میں نماز پڑھا کرتا تھا۔

گوروں کے لیے بڑے دن کے ایام میں جیلر وغیرہ کی طرف سے دعوت کا سامان کیا جاتا ہے۔ اور ان کو ہر قسم کے میوے اور کھانے دیے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ تمام برتاؤ میں گوروں کو کالوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہے۔ کام انھیں ہلکا ملتا ہے، اپنے عزیزوں سے دوستوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے میں انھیں زیادہ آسانی ہوتی ہے، ہر سہ ماہی پر سپرنٹنڈنٹ جیل کا رگزار قیدیوں کو رہائی کے جو دن اپنی طرف سے دیتا ہے اس رعایت سے بھی سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ ملازمانِ جیل انھیں کسی طرح دق نہیں کر سکتے، بلکہ اکثر موقعوں پر دیدہ و دانستہ ان کی بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں

حسرت کی زندانی شاعری پر ایک نظر

(۳)

یہ سب کچھ تو ہوا جیل میں حسرت پر جو گزری اور جیل میں حسرت نے جو کچھ دیکھا، اس کا کسی حد تک نظارہ آپ نے کر لیا، آیئے اب یہ دیکھیں کہ ایام اسیری میں حسرت کی طبع موزوں کی کیفیت کیا رہی ؟

جو کچھ جیل میں انھوں نے کہا، اس میں وقت کی سیاست اور حکومت کی قہرمانیت سے متعلق کچھ تاثرات نظر آتے ہیں یا نہیں ؟

دیوانِ حسرت موہانی کا حصہ (اول) ان غزلوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک کے دوران میں لکھی گئیں، ان غزلوں پر ایک نظر ڈالنے سے حسرت کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

جیل کی شاعری میں جہاں تغزل کا یہ رنگ ہے کہ :-

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا

وارداتِ زنداں بھی صاف طور پر نظر آتے ہیں، مثلاً ـ

مایۂ عشرت بے حد ہے غم قید انا　　میں شناسا بھی نہیں رنج گرفتاری کا

اس شعر میں جس عزیمت کا رنگ جھلکتا ہے، مقطع میں آکر وہ عزیمت استقامت کے ساتھ مل کر کچھ عجیب شان پیدا کر دیتی ہے ـ

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ　　گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا!

ایک دوسری غزل میں تغزل کی سحر طرازی اور اثر آفرینی ملاحظہ ہو:

ایک ہی بار ہوئی وجہِ گرفتاریِ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

طعنِ احباب سنے، سرزنشِ خلق سہی
ہم نے کیا کیا تری خاطر سے گوارا نہ کیا

یا پھر یہ غضب کا مقطع ایک دوسری غزل کا!

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرتؔ کا
وہ وضع پارسا اس کی، وہ عشقِ پاک بازاس کا

لیکن داستانِ عشق کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ان تجربوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکے جو ایام اسیری میں حاصل ہوئے تھے:

شکوہ بے مہریِ احباب کا کروں کیا حسرتؔ
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا!

تو نے حسرتؔ کی یہاں تہذیب رسم عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

اور پھر صیاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قفس کے اندر سے نغمہ سرا ہوتے ہیں:

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا؟　　باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا؟

اسی ردیف اور قافیے میں :

کافی ہیں میرے بعد پریشانیاں تری　　میں کشتۂ وفا ہوں مراخوں بہا ہے کیا ؟

اور اس کے بعد، ہمدردوں اور چارہ سازوں کو اپنی آپ بیتی سنانے کے بعد کہتے ہیں :

رونے لگے ابھی سے کہ ہے ابتدائے حال　　تم نے ابھی فسانۂ حسرت سنا ہے کیا ؟

اور کبھی کبھی تو صاف اور واضح الفاظ میں، بہت کچھ کہہ جاتے ہیں :

اہلِ رضا کی جان ہے اتنی سی یہ امید
کچھ اور بھی ہے اس ستم بر بلا کے بعد
تم پر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد
دامانِ صبر ہاتھ سے حسرت نہ دیجیو
گر خواہشِ طرب ہے ہجوم بلا کے بعد

اپنے وطن میں آزادی کی تڑپ، اور اہل وطن میں ستم گروں سے ٹکر لینے کی جرأت دیکھ کر حسرت خاموش نہیں رہ سکتے، زبان شعر میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں

صبر مشکل ہے ضبط ہے دشوار　　دل وحشی ہے اور جنونِ بہار!
اے تری ذات مجمع ضدّین　　حسن سب نور ہے تو شوق سب نار
غیر ممکن ہے ہم سے طاعتِ غیر　　اے جفا کار، اے غریب آزار

اور یہ کہتے کہتے کنجِ قفس میں بیٹھ کر وہ اپنے صیاد کو متنبہ کرتے ہیں :

روح آزاد ہے خیال آزاد　　جسم حسرت کی قید ہے بے کار

اور زندگی کی آخری سانس تک ان کی روح کبھی آزاد رہی، اور خیال بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ صیاد بدلتے رہے، لیکن جس استقلال سے انھوں نے فرنگی استعمار

کا مقابلہ کیا، اسی شان سے ہندو سامراج سے بھی خم ٹھونک کر لڑتے رہے۔

وطن کی آزادی کا جذبہ حسرت کو بے قرار رکھتا تھا، جیل میں ایک طرف چکی پیس رہے تھے، دوسری طرف ان کے منہ سے جو الفاظ شعر بن کر نکل رہے تھے وہ تیر و پیکان سے کم نہ تھے، کہتے ہیں اور کس جوش و خروش کے ساتھ کہتے ہیں:

خرمنِ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان
فکرِ معاش سے گزر، حوصلۂ معاد کر
اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کو، کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

ان چند اشعار میں زندانی شاعر نے آزادیٔ روح اور آزادیٔ خیال کا کتنا محکم ثبوت پیش کر دیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم سے پہلے۔ طرابلس اور بلقان کی معرکہ آرائیاں، صلیبیوں کی یورش اور عالم اسلام کی ناچاریاں، ارضِ خلافت یعنی ترکیہ پہ اتحادی قوتوں کی شہ سے، یونان وغیرہ کی یلغاریں، اور بعد میں انگلستان، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک کی اعلانیہ ترک دشمنی، اور آخر کار پہلی جنگ عظیم کا آغاز، اگرچہ زندانی شاعر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید اور محبوس تھا، باہر کی خبر کسی طرح اگر

بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی، لیکن پرانے قیدی جاتے اور نئے آتے رہتے تھے ان تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل سے باہر کی خبریں کسی نہ کسی حد تک مل ہی جاتی تھیں، جن سے حالات کا اندازہ ہو جاتا تھا، اور یہی معلومات تاثرات کی صورت اختیار کر لینے کے بعد، شعر کے قالب میں بھی کبھی کبھی ڈھل جایا کرتے تھے، جیل میں لکھنا پڑھنا جرم تھا، قیدی کے پاس نہ کاغذ تھا، نہ قلم نہ دوات کوئلے سے لے کر قوتِ حافظہ کی تربیت تک سے کام لے کر، جو اشعار محفوظ رہ سکے اور بہت سے ضائع ہو گئے، وہ اس دعوے کی دلیل ہیں۔

اگرچہ حسرت نہ مسلم لیگ سے سروکار رکھتے تھے، نہ کسی اور ملّی جماعت سے، وہ غیر مشروط طور پر کانگریس میں شریک تھے اور اس کی چلائی ہوئی تحریکوں میں عملی حصہ لیتے رہتے تھے، لیکن ایسا بھی نہ کہ بلقان سے جو "سیلاب بلا" بڑھتا آ رہا تھا عالم اسلام کی طرف اسے ان کی آنکھیں نہ دیکھ سکتیں، اور وہ حال کے آئینے میں مستقبل کی جھلک نہ دیکھ سکتے، وہ بہر حال مسلمان تھے، اسلام سے ان کی شیفتگی ہر قسم کے شک و شبے سے بالا تھی، مسلمانوں کی تباہی و بربادی، عالم اسلام پر دشمنوں کی غارت گری اور تاخت و تاراج مسلمانانِ ہند کی بے حسی، اور سرکار پرستی کے مناظر دیکھ کر ان کا دل خون ہو جاتا تھا، اور وہ کہہ اٹھتے تھے:

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر،

اور اس کے بعد ایک غیور و خوددار، حساس اور باحمیت مسلمان کی طرح کہتے ہیں۔

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہوکر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہوکر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہوکر

حسرت کے سیاسی اشعار میں ان کا رنگ تغزل نظر تو آتا ہے لیکن کچھ زیادہ چوکھا نہیں لیکن بعض بعض غزلوں میں انھوں نے سیاسی حوادث اور احوالِ ملک پر جو اشارے کیے ہیں ان میں درس و عظ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تغزل کی پوری شان بھی، ایک غزل کے چند اشعار سنیے:

ہے غضب ہنگامۂ فصلِ بہار اب کی برس
دل پہ کا ہے کو رہے گا اختیار اب کی برس
ہے جنونِ شوق ابھی سے بے قرار اب کی برس
کیا غضب ڈھائے گا طوفانِ بہار اب کی برس
کامیابی جلد ہوگی آکے پا بوسِ امید
کھینچ ڈالیں اور رنجِ انتظار اب کی برس

اور اب صاف صاف کہتے ہیں:

حادثے سنہ آٹھ میں گزرے بہت اب دیکھیے
کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار اب کی برس
فرقتِ ساقی میں ہم حسرت کشانِ بادہ سے
مل کے رویا خوب ابرِ نوبہار اب کی برس

اور یہ شعر تو قیامت کا ہے :

مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اے عجب
یاد یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس

تغزل کی پوری شان برقرار رکھتے ہوئے ایک اور غزل میں حسرت نے سیاسی امیال و عواطف ، اور احوال و کوائف کی نشان دہی کی ہے ، فرماتے ہیں اور اپنی حیات زنداں کی بے بسی اور بے چارگی کو مدنظر رکھتے ہوئے خود اپنے سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں

پیمانِ وفا نہ کر فراموش — اے حسرتِ بے قرار خاموش
اس عشوۂ نازنیں کے جلوے — ہیں دشمنِ عقل مصلحت کوش

اور ذرا اس شعر کے تیور اور بانکپن کو اس کی معنویت کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے :

پوشیدہ سکون یاس میں ہے — اک محشرِ اضطراب خاموش

مقطع کی حقیقت اور واقعیت پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لیجئے :

آزاد ہیں قید میں بھی حسرت — ہم دل شدگانِ خود فراموش

یورپ اور ایشیا کی ہوس جوع الارض پر زبان شعر سے اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص
چلنے لگے نہ سارے جہاں میں ہوائے حرص
ہے چین کوریا کے مٹانے پہ مستعد
جاپان بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص

اور پھر اپنی بیڑی پر اور اپنی چکی پر نظر ڈال کر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں :

جانِ وفا شعار کو شکوۂ غم سے کیا غرض — عذرِ جفا سے کام کیا ؟ عرضِ کرم سے کیا غرض

جیل میں چکی کی مشقت جاری تھی کہ ماہ مبارک رمضان آگیا، شرعی طور پر اگر یہ زندانی روزہ نہ رکھتا تو جائز تھا، لیکن یہ مقام رخصت سے بلند ہو کر مقام عزیمت پر فائز ہو چکا تھا، آدمی کی واقعی مجبوری کو شرع نظر انداز نہیں کرتی، اسے رخصت دیتی ہے کہ ایسے مواقع پر اس سے فائدہ اٹھائے، مثلاً ایک شخص فاقے سے ہے، اور جاں بلب ہو چکا ہے، اب اگر وہ سؤر کا گوشت کھا کر جان بچا لے تو گناہ گار نہیں ہوگا، لیکن کوئی شخص جان سے گزر جائے اور سور کا گوشت نہ کھائے تو یہ عزیمت ہے، جیل کی پابندیوں اور مجبوریوں کے باعث کہ افطار کا انتظام تھا، نہ سحر کا، ہر قیدی کو شرعاً رخصت تھی کہ روزہ قضا کر دے، لیکن حسرت نے اور ان کے سے چند اور دیوانوں نے رخصت پر عزیمت کو ترجیح دی، جیل کی سختیاں سہتے رہے۔ چکی کی مشقت کا سلسلہ جاری رکھا مگر ایک روزہ بھی نہ چھوڑا۔ اس موقع پر جمعۃ الوداع کے دن جو کیفیت ان زندانی روزہ داروں کی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں، بہرحال جمعۃ الوداع کے موقع پر حسرت نے خطبہ بھی دیا، اور نماز بھی پڑھائی۔ اور الوداعی اشعار بھی کہے، ایک ایک شعر کیف و تاثر، سوز و گداز، درد و حرماں، کی تصویر ہے، شعر ملاحظہ ہوں۔

الوداع اے ماہِ رمضاں الوداع
الوداع اے مونسِ جاں الوداع
تجھ سے روشن تھا سوادِ ملکِ جاں
اے چراغِ نورِ ایماں الوداع
اے زمانِ رحمتِ حق الوداع
اے محبِ اہلِ عصیاں الوداع

اے نشانِ شانِ صبر و فقر و عشق
شاہدِ عشاقِ حیراں الوداع
عینِ راحت تجھ سے تھی تکلیفِ قید
اے انیسِ اہلِ زنداں الوداع

تغزل کے رنگ میں سیاسی شعر:

کر نہ ہم غم زدوں پہ جور اتنا گل نہ ہو جائے عاشقی کا چراغ

پھر وقت کے طالع آزماؤں اور مفاد پرستوں پر کتنا بھرپور طنز کرتے ہیں:

ہم عشق کے بندوں کو اسلام سے کیا مطلب
اس بات سے خود ہو گا وہ دشمن دیں واقف

اور پھر اپنا جوشِ شہادت بیان کرتے ہیں:

ہر طرف رندی و مستی کا نمودار ہے رنگ
ہے خرابی سے خرابات مغاں کی رونق
کیا نہیں شوقِ شہادت کا یہ کافی اعزاز
کہ سراسر ہے ترے نوک سناں کی رونق

پھر طنز۔ لیکن کتنا لطیف، کتنا بھرپور اور کس درجہ قیامت خیز:

تیرے حسنِ نظر افروز کے جلوے اے شوخ
ہو گئے ہیں نگہِ دیدہ وراں کی رونق

اپنے شوقِ شہادت کا بار بار اظہار کرتے ہیں، اپنی جذبۂ شہادت کی نئی نئی توجیہہ کرتے ہیں، اپنی سرفروشی و جاں نثاری اور خوئے استقلال و عزیمت کی جلوہ آرائی کو الفاظ کا لباس پہنا کر کیا کچھ نہیں کہہ جاتے، صرف دو شعر سن لیجیے!

اس درجہ نہ بے تاب ہو اے شوقِ شہادت ہے میان میں اس شوخ کی شمشیر ابھی تک

اور پھر یہ شعر:

تھے حق پہ وہ بے شک کہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا
دنیا میں بپا ماتم شبیر ابھی تک

ایک اور بیانِ حقیقت:

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِّ وطن تمام
سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

طرابلس میں انور پاشا کی حربی کامرانیاں مسلمانانِ ہند کے لیے مژدۂ نشاط و طرب تھیں حسرت کا بھی یہی عالم تھا:

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے
قلّتِ افواجِ ترکی پر نہ ہو اطلی دلیر!
ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند
رایتِ حریت و حق جو کفِ انور میں ہے

باشندگانِ وطن کی بے حسی، فرنگی سامراج کی جورِ البقر اور جذبۂ اعلائے کلمۃ الحق سے بے خود ہو کر جیل کا یہ مکین بے پروا ہو کر کہتا ہے:

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِّ وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلق خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر یہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب دیکھیے کب تک رہے

اور پھر فخر سے کہتے ہیں :

بندۂ بندگانِ حضرتِ عشق　　حسرتِ سرفرازِ رسوائی

جیل کے احوال و مقامات :

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا
منظورِ وفا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

حسرت جورِ فرنگ سے مایوس ہیں۔ اس سے رحم کے متمنی نہیں ہوتے، لیکن اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں۔

ڈر غلبۂ اعدا سے نہ حسرت کہ ہے نزدیک
فرمائیں مدد سیّد والائے مدینہؐ

اور پھر کس عالم سرخوشی میں کہہ اٹھتے ہیں :-

اس قیدِ غم پہ قربان حسرت　　عالی جنابی، گردوں رکابی

پال گنگا دھر تلک ان کے سیاسی مرشد تھے، ان کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں کہ جیل میں:

مغموم نہ ہو خاطرِ حسرت کہ تلک تک
پیغامِ وفا باد سحر لے کے گئی ہے
تلک کی شان میں قصیدہ کہنے میں بھی دریغ نہیں
لے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن
حق شناس وحق پسند وحق یقین وحق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بے باک کی
تجھ سے روشن اہل اخلاص وصفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند
خدمت ہندوستاں میں کلفت قید و محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی!
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو!
اے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن

مدتِ قید اب ختم ہونے کو آئی، شاعر کے دل میں طرح طرح کی کیفیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

بڑھ چلا جوشِ آزر و حسرت ختم ہونے کو آئی قیدِ فرنگ

لیکن رہائی کے بعد بھی حسرت کی وضع میں کوئی فرق نہیں آیا، سید سلیمان ندوی

تحریر فرماتے ہیں :

"حسرت سے میری ملاقات قید سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں ہوئی، ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب آپ کو بلا رہے ہیں، باہر نکلا تو حسرت تھے میں نے کہا آپ نے تکلیف کیوں کی، اندر کیوں نہیں چلے آئے؟ اس زمانے کی سیاسی پستی کا اندازہ کیجیے، حسرت نے جواب دیا، چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں اس لیے احتیاط کی راہ سے مطلع کر دیا، میں حسرت صاحب کو اپنے کلبۂ احزاں میں لایا سردی کا زمانہ تھا، پائتیا نے کمبل رکھ دیا، وہ کمبل ولائتی تھا حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا تلک مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے اور ہندوستان کی آزادی کی پیش گوئی جس یقین اور عقیدے کی پختگی کے ساتھ کرتے، اس پر بڑا تعجب ہوتا، اور ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی، قید سے چھوٹنے کے بعد حسرت کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ سیاست سے باز آجائیں، لیکن انھوں نے اس نصیحت پر کان نہیں رکھا، دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا اردوئے معلیٰ کے قدر دانوں نے خریداری ترک کر دی، لوگوں نے ملنے جلنے سے احتراز شروع کر دیا۔ مگر حسرت اپنے عقیدے میں اور پختہ ہوتے چلے گئے، اور شروع سے جو اصول قائم کیا تھا اس میں سرمو فرق نہ آنے دیا۔"

اور زندگی کے آخری سانس تک چٹان کی طرح اپنے اصول پر قائم رہے۔

با وصف نارسائی تا ملکِ یاس حسرتؔ
نالے ہمارے پہنچے، اور سر بلند پہنچے

مسجدِ کانپور کا المیہ

(۱)

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۱۳ء تک جتنے حوادث رونما ہوئے ان میں مسجد کانپور کا حادثۂ انہدام اتنا بڑا المیہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس سے پہلے تک مسلمان برطانوی حکومت کے مقابلے میں سر سے کفن باندھ کر کبھی نہیں آئے تھے، وہ اس کی زیادتیوں کو سمجھتے تھے، اس کے ظلم و جور کو برداشت کرتے تھے، اس کی ناانصافیوں پر خاموشی سے کام لیتے تھے، اپنے حقوق کی پامالی دیکھتے تھے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔ بے شک انھیں حکومت سے شکایات تھیں، وہ کچھ اپنے مطالبات رکھتے تھے انگریزوں کی اکثریت پرستی اور اقلیت دشمنی سے وہ بیزار تھے، لیکن غدر کے سانحات نے انھیں اتنا دہشت زدہ اور سراسیمہ کر دیا تھا کہ آئینی اور دستوری حدود سے قدم باہر نکالنے کا انھوں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا وہ جادۂ وفا پر گامزن تھے اور اسی کو اپنا نصب العین انھوں نے قرار دے لیا تھا۔ لیکن خدا کے گھر کا انہدام وہ نہ دیکھ سکے اور انھوں نے جان کی بازی لگا دی، اور دنیا کی سب سے بڑی حکومت سے ٹکر لینے پر تیار ہو گئے۔ جب تک قومی حقوق و مسائل کا سوال تھا وہ صابر و شاکر تھے۔ لیکن جب مذہبی غیرت و حمیت

کا مسئلہ سامنے آیا تو عروس مرگ سے ہم کنار ہونے کا انھوں نے تہیہ کر لیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس واقعۂ ہائلہ پر اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے، اور بالکل سچ فرمایا ہے:-

"بلقان کا شورِ محشر ابھی برپا ہی تھا کہ مسجد کانپور کا ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور قومی جوش وخروش کے طوفان کا سب سے بڑا خونین منظر ہے یہ عین اس وقت رونما ہوا جب بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور بھڑک رہی تھی —

۲۴ جنوری ۱۹۱۳ء کو ترکوں نے ایڈریانوپل (ادرنہ) لے لیا تھا، اس کے بعد عملاً جنگ ختم ہو چکی تھی مگر صلح ابھی تک نہیں ہوئی تھی، صلح کانفرنس کا آغاز ستمبر ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا۔ مسلمانوں کے دل برطانوی وزارت خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے دلوں کا بخار نکلنے نہیں پایا تھا کہ صوبۂ متحدہ (یو۔ پی) کے گورنر سر جیمس مسٹن اور ان کے ماتحت حکّام کانپور کی غلط کاریوں نے خود ہندوستان میں اس کا ایک موقع بہم پہنچا دیا۔ کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ واقع تھی وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک سڑک نکالی جس میں مسجد کا ایک حصّہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آگیا۔ اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا۔ حالانکہ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر سڑک نکالی گئی۔

۳ اگست ۱۹۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی مسلمانانِ کانپور نے مولانا (عبدالقادر) آزاد سبحانی مدرس مدرسہ الٰہیات کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ جلسے میں کافی جوش وخروش پیدا ہوا۔ جس کے بعد پُرجوش مسلمانوں نے جس میں کئی بچّے بھی تھے مسجد کا رخ کیا

اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چن چن کر رکھنے لگے۔ مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کانپور نے یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا، فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے نہایت بے رحمی سے ان پر گولیاں برسائیں اور قریب آکر برچھے (نیزے) مارے شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے۔ شہداء کی تعداد کا سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا۔ اس خونین سانحے نے تمام ہندوستان کو خونین بنا دیا۔ آتش بیان مقرروں، شعلہ نوا انشاپردازوں اور آتش نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جد وجہد اور حریت پرستی کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے!"

اس زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی 'الہلال' کے رکن ادارت تھے انھوں نے ایک نہایت زبردست مقالہ "مشہد اکبر" کے عنوان سے لکھا جو الہلال ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ تحریر کا نکھار ایسا تھا کہ بہت سے لوگوں نے اسے مولانا ابوالکلام کا مقالہ سمجھا۔ بعد میں جو کتابیں لوگوں نے مولانا آزاد کے مجموعہ مضامین کی صورت میں شائع کیں ان میں یہ مقالہ بھی انہی کے نام سے شائع ہوگیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس حادثۂ خوں آشام پر اظہار خیال کرتے ہوئے مزید تحریر فرمایا ہے۔

"اس واقعے کو واقعہ بنانے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو، مسلمانانِ کانپور کی پُرجوش حمایت میں کھڑا کر دینے، شہیدوں کے عزیزوں کی دل دہی، دست گیری، زخمیوں کی تیمارداری، اور قیدیوں کی قانونی چارہ جوئی کا غیر محدود جذبہ جس کی زبان و قلم کا سب سے زیادہ رہینِ منت ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات ہے، اس زمانے کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو

ہر مکتب خیال کے لوگوں نے جس اتحاد اور اتفاق کے ساتھ حکومت کی اس غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ اس نے حکومت کو حواس باختہ کر دیا اور ایک مرتبہ پھر وہ "طے شدہ" اور ناقابل تنسیخ" فیصلے کو بدلنے پر آمادہ ہو گئی، ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ بہ نفس نفیس کانپور تشریف لائے، سر علی امام نے حکومت ہند کی طرف سے، اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے گفت و شنید شروع کی جس کا نتیجہ نکلا کہ :-

- جملہ قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے گا۔
- جن لوگوں کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں وہ واپس لے لیے جائیں گے۔
- اور مسجد جو بلندی پر واقع تھی اس کے منہدم شدہ حصے کی از سر نو تعمیر اس طرح کی جائے گی کہ اوپر چھت لے کر وضو خانہ پھر سے قائم کر دیا جائے گا اور چھت کے نیچے سے آمد و رفت کا راستہ رکھا جائے گا۔

یہ ایسا فیصلہ تھا جسے فریقین نے خوش دلی اور مسرت کے ساتھ منظور کیا، اس فیصلے کا اعلان بذاتِ خود وائسرائے نے کیا۔ اور اس کی مدح و تحسین سرکار پرستوں نے بھی کی اور حکومت کے باغیوں اور حریت مآبوں نے بھی۔ مسلمانوں کی لاج رہ گئی ایک بہت بڑا فتنہ دب گیا۔ اور پہلی مرتبہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ بھی ایک طاقت ہیں۔ اور اپنے قومی اور دینی مطالبات حکومت سے منوانے کی سکت رکھتے ہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد سے پہلی مرتبہ مسلمانوں نے خود اعتمادی، خودی اور خود نگری کا مظاہرہ کیا اور اس میں وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے تھے۔

علامہ شبلی کی نظم شکریہ مولانا شبلی اگرچہ عملی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن شاعری کی حد تک بہت بڑے حریت مآب، اور حکومت کے نکتہ چیں تھے۔ اس موقع پر وائسرائے

کی نیک دلی اور شرافتِ نفس کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک طویل نظم لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں :

اے ہمایوں گہر و افسر و اورنگ شہی
وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے

تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
یہ حقیقت میں ظفرمندیِ سلطانی ہے

تیرے لطف و کرمِ عام نے دے دی یہ ندا
کوئی مجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے

تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
بازوؤں میں یہ ترے زورِ جہاں بانی ہے

گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی
شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے!

کشتگانِ معرکۂ کانپور

مولانا شبلی کا "شکریۂ احسان" شاعرانہ مبالغہ سے خالی نہیں نظر آتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ وہ بے حد جذباتی آدمی تھے۔ ایک معمولی سا واقعہ بھی ان کے احساسِ دل پر ضرورت سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوتا تھا۔ کانپور میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی تھی اور جس بے دردی سے مسلمانوں کو ہدفِ ستم بنایا گیا تھا، حد یہ ہے کہ بچوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا تھا۔ اس نے مولانا شبلی کے تاثرات کو بہت زیادہ شدید کر دیا تھا۔ اس حادثۂ المیہ پر انھوں نے متعدد معرکہ آرا، پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں، جو مولانا ابوالکلام کے الہلال، مولانا محمد علی کے ہمدرد اور ظفر علی خاں کے زمیندار میں شائع ہو کر قومی رجز کا کام دیتی تھیں اور بچے بچے کی زبان پر جاری ہو جاتی تھیں۔ اس سلسلے کی ایک نظم میں انھوں نے فرمایا تھا ؎

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں

سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار | از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دل دادۂ فنا | جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم، آئی یہ صدا | "ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں!"

ایک اور نظم جو تاثیر و تاثر میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ الہلال میں شائع ہوئی تھی۔ جس کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سیّد سجّاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ ہندِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

اور غضب کا شعر تو یہ ہے:

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں، سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

پھر اپنی محرومی پر شکوہ سنج ہیں:-

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی اپنی بدبختی سے، محروم سعادت ہے

شبلی کا ایک قطعہ اور سن لیجئے:

اگرچہ آنکھ میں نم نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کانپور کے کچھ زخمیوں کا بھی حق ہے

حکومت کے عزائم اور یہ سب کچھ دفعتہً نہیں ہوگیا تھا نہ حکومت نے بغیر کسی منصوبے کے مسجد منہدم کی، نہ مسلمانوں نے، ایک بیک قانون ہاتھ میں لے لیا۔ حکومت کے عزائم مسلمانوں پر واضح ہو چکے تھے اور وہ ایوانِ حکومت میں عرض و التجا سے کام لے رہے تھے۔ چنانچہ سر جیمس مسٹن نومبر ۱۹۱۲ء میں جب کانپور تشریف لائے تو حکام بلدیہ اور ڈپٹی کمشنر کے عزائم سے لیفٹننٹ گورنر کو مطلع کرتے ہوئے استدعا کی کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اور مسجد کی حرمت کا خیال حکومت کو ہر حال میں رکھنا چاہیے، جب کہ اس سڑک پر واقع مندر کو بچانے کے لیے سڑک کو ٹیڑھا کیا جانا منظور کیا جاتا تھا، گورنر نے اس استدعا کے جواب میں کہا،

"مسجد اور مندر دونوں میں سے کسی پر دست اندازی نہیں کی جائے گی۔"

ہز آنر — اس وقت تک لیفٹننٹ گورنر کو ہز آنر اور گورنر کو ہز ایکسی لینسی کہا جاتا تھا — کی پوری اور مفصل تقریر "ہیرالڈ آف انڈیا" (کان پور) کی ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی جس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

ہمدرد کا مقالہ افتتاحیہ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ہمدرد میں، جو طویل مقالہ افتتاحیہ اس بحث پر شائع ہوا ہے۔ اس کے بعض پہلو اگر پیش نظر رہیں تو بہتر ہے:

"مسلمانان کان پور نے مسجد میں ایک جلسہ کیا جس میں پانچ علماء نے جن میں مولانا آزاد سبحانی، پرنسپل مدرسہ الٰہیات بھی شامل تھے۔ باضابطہ فتویٰ دے دیا کہ حصہ زیر بحث مذہباً اور شرعاً شامل مسجد ہے، شرعِ اسلامی کی رو سے مسجد یا اس کے کسی حصے کی بیع یا مبادلہ خلاف شریعت ہے!"

اس کے بعد مسلمانوں کا ایک وفد کلکٹر سے ملا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا؛ چنانچہ آنریبل مسٹر شاہد حسین بیرسٹر ایٹ لا — جن کے صاحبزادے فواد شاہد حسین

پاک فضائیہ کے ایک افسر ہیں اور جنگ پاکستان و بھارت میں شاندار کارنامے انجام دے چکے ہیں ۔ کے توسط سے ۱۴ اپریل ۱۹۱۳ء کو ہز آنر لیفٹننٹ گورنر صوبجات متحدہ (یو۔پی) کی خدمت میں میموریل پیش کیا کہ چونکہ اس حصے کے انہدام سے ان کے مذہب پر دست اندازی ہوتی ہے جو حکومت کی مصلحت کے منافی ہے، لہٰذا حضور لیفٹننٹ گورنر بہادر حصۂ مسجد کو انہدام سے محفوظ رکھیں ۔ اس میموریل کے جواب میں انڈر سکریٹری صوبائی حکومت نے ارقام فرمایا ۔

"لیفٹننٹ بہادر نے میموریل پیش کنندگان کی گذارش پر بخوبی غور فرما لیا ہے اور واقعات کو مقامی افسروں سے دریافت کر لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ، سڑک کی لائن جو پہلے تجویز ہو چکی ہے برقرار رکھنی چاہئے۔ ہز آنر نے اس امر کا ذمہ لیا تھا کہ مسجد میں دست اندازی نہیں کی جائے گی لیکن منہ ہاتھ دھونے کی جگہ عمارت کا حصہ نہیں ہے!"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمدرد نے اپنے اداریے میں لکھا :

"ہمیں معاف کیا جائے اگر ہم یہ عرض کریں کہ ہز آنر کی بالغ نظری چاہے حکومت کے کیسے ہی راز ہائے سربستہ حل کرنے میں کامیاب ہو جائے مگر یہ مسئلہ ایک خاص مذہب اور اس مذہب کی ایک شاخ اور فن سے تعلق رکھتا ہے اور بجز علماء یا فقہائے اسلام کے دوسرے کا کام نہیں کہ اسے طے کرے، علماء نے فتویٰ دے دیا ہے کہ یہ حصہ مذہباً اور شرعاً داخل و شامل مسجد ہے، بہتر ہوتا کہ پر جلال اور باعظمت گورنمنٹ سیاسی و انتظامی امور کی باگ اپنے بارعب و داب عہدے داروں کے ہاتھ میں رکھتی مگر افتاء اور تشریح مسائل کا کام غریب اور میلے کچیلے کپڑے والے مولویوں کے ہاتھ میں رہنے دیتی ۔ تم خداوندی کہلاؤ خدا اور سہی"

اسی مقالے میں ہمدرد نے کہا ہے ۔

" یکایک ۳۰ر جولائی ۱۹۱۳ء کو ہز آنر سر جیمس مسٹن خود کانپور تشریف لائے اور مسجد کا معائنہ فرمایا، کسے معلوم تھا کہ ہز آنر کی تشریف آوری کی شب حصّۂ مسجد کی شب رحلت ہوگی،

علی الصباح سنگین چڑھائے ہوئے مسلح پولیس کے سپاہی مسجد کے ہر چہار طرف متعین ہوگئے، ہمارے خاص کارسپانڈنٹ نے اس روز جو تار ہمیں دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی طرف آنے کے تمام راستے روک دیئے گئے تھے ۔ لوگ بہت جلد سمجھ گئے کہ یہ ساری تیاری مسجد کے اس حصّے کو منہدم کرنے کے لیے ہے جو سڑک کی داغ بیل میں آتا ہے، پولیس کے سوا اس طرف پھر رہے تھے، اور جہاں کہیں مجمع ہوجاتا تھا اسے منتشر کر دیتے تھے ۔ انہدام کے بعد ہزاروں مسلمان جن میں بہت سے کارخانوں کے مزدور تھے دن بھر اس موقع کو دیکھنے آتے رہے ! "

ہمدرد نے مزید لکھا ۔

" مسلمانانِ کان پور کا مسلک ابتدا سے آخر تک نہایت قابلِ تعریف رہا، انھوں نے کلکٹر کے پاس وفد بھیجا ۔ ہز آنر کی خدمت میں محضر بھیجے مگر شنوائی نہ ہوئی، آنریبل مسٹر شاہد حسین کی مراسلت ناکام ہوئی ۔ آنریبل راجہ صاحب محمود آباد یا تھا ، کو دوسرا محضر دے کر ہز آنر کی خدمت میں شملہ روانہ کیا ۔ راجہ صاحب بہادر کو ہز آنر نے یقین دیا کہ ان کی شفاعت رائیگاں نہ جائے گی ۔ مگر چند دن کے بعد ہی اصلیت کھل گئی ۔ ہز آنر فرماتے ہیں کہ ان کے احکام پہلے ہی " ناطق اور قطعی " تھے مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا راجہ صاحب بہادر سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ زمین آسمان ٹل جائیں مگر ہمارا حکم نہ ٹلے گا "

اب " پانیر " کی روش بھی ملاحظہ کیجیے، وہ لکھتا ہے :-

"اس کارروائی (انہدام مسجد) کے بعد یہ معاملہ جو کچھ عرصے سے زیر بحث ہے ختم ہو جائے گا"

مگر پانیر کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان اس مذہبی دست اندازی کو ہرگز نہیں بھول سکتے۔ یہ ایک خار ہے جو ان کے سینے میں چبھ رہا ہے اور چبھتا رہے گا۔ جب تک منہدم شدہ حصّہ پہلی صورت میں نہ بنا دیا جائے گا۔ یوں تو تمام روئے زمین مسلمانوں کے لیے مسجد ہے، اور وہ ہر جگہ نماز پڑھ سکتا ہے، اور ہزار مسٹن اور ہٹلر اسے باز نہیں رکھ سکتے مگر ہمیں شکایت ہے تو اس امر کی کہ ایک نہایت وقیع اسلامی اصول توڑا گیا ہے، حالانکہ تعلیم اسلام کی رو سے مسجد کی اینٹ، پتھر، گارا، کنکر، ذرہ، سب کے سب مقدّس ہیں اور سچّا مسلمان کسی صورت میں کبھی ان کی بے حرمتی گوارا نہیں کرے گا۔ ہز آنر کو چاہیے تھا کہ مسلمانوں کو بتا دیتے کہ ان کے احکام قطعی اور ناطق تھے اور مسجد کو منہدم کرنے کی منظوری دینے سے پہلے مسلمانوں کو موقع دیتے کہ وہ ان کے فیصلے کے خلاف حکومت ہند سے اپیل کر دیتے۔

کچھ عرصہ پہلے کان پور کے صاحب مجسٹریٹ ضلع بھی مسجد کے حصّۂ شرقی کے انہدام میں شرکت فرمانے اور اس کار خیر میں حصّہ لینے تشریف لائے، صاحب موصوف شرقی حصّۂ مسجد میں بوٹ پہنے داخل ہوئے، واپسی پر صاحب موصوف نے علی الاعلان اپنی رائے ظاہر فرمائی کہ حصّۂ متنازعہ کسی طرح جزو مسجد نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کسی مسلمان نے وہاں بوٹ پہن کر جانے سے انھیں نہیں روکا جب مسجد کی تعریف یہی ٹھہری کہ وہ حصّہ جس میں صاحب بہادروں کے بوٹ نہ جا سکتے ہوں۔ مسجد ہے تو ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک کی کسی مسجد کا چاہے وہ شاہجہاں بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد جہاں نما (جامع مسجد) ہی کیوں نہ ہو، دروازہ و عمارت، شمالی، مشرقی و جنوبی صحن اور حوض وغیرہ ایسے مقامات نہیں جو شامل

"داخل مسجد سمجھے جائیں، کیونکہ یقیناً یہ وہ مقامات ہیں جہاں صاحب بہادروں کے بوٹ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ ممکن ہے ہمیں صاحب مجسٹریٹ بہادر ضلع کانپور کے الفاظ یا خیالات کی سبکی کرنے کا مرتکب قرار دیا جائے۔ لیکن جو شخص ہمیں (اس جرم) کا مرتکب قرار دے اسے چاہیئے کہ پہلے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر دیکھے اور اپنے دل سے صلاح لے کر سوچے کہ مسلمانوں کے مذہب کے ساتھ اس طرح مزاح و ظرافت کرنا زیادہ سنگین جرم ہے یا صاحب بہادر کے الفاظ کی سبکی کرنا زیادہ سخت الزام۔ سہ ۱۹"

گورنر یوپی کے نام مولانا محمد علی کا خط

مولانا محمد علی نے سر جیمس مسٹن لیفٹننٹ گورنر یوپی کو متعدد ذاتی خط لکھ کر اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی، موصوف نے ہر خط کا جواب دیا۔ اور اخلاق و اخلاص کا بڑی دریا دلی کے ساتھ مظاہرہ کیا، لیکن اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ اس میں کسی طرح کی ترمیم و تغیر پر تیار نہیں ہوئے۔ ۳۰ جون ۱۹۱۳ء کو انھوں نے سر جیمس مسٹن کو کئی مختصر خط لکھ چکنے کے بعد ایک طویل خط لکھا جس میں فرمایا:

"باوجودیکہ یور آنر میری درخواست کو میانہ روی اور راستی پر محمول فرماتے ہیں لیکن اب تک اس کا کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ لیکن میں اب تک مایوس نہیں ہوں اور ایک مرتبہ پھر یور آنر سے التجا کرتا ہوں کہ علماء اور قانون داں اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔ جس امر پر سب سے پہلے توجہ ہونی چاہیے یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی عمارت، جو فی سبیل اللہ وقف کردی گئی ہو اس کا کوئی حصہ بیع یا کسی اور مقصد کے لیے منتقل کیا جاسکتا ہے! مجھے وثوق ہے کہ اس قسم کی موقوفہ املاک کو کسی اور

غرض کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اگر میرا یہ وثوق بجا ہے تو اس عمارت کے کسی حصّے کو بھی منہدم کرنے سے ہم سب کے محسوسات کو صدمہ پہنچے گا، مسٹر بٹلر (مجسٹریٹ) مسجد کے زیر بحث حصّے میں بلا اجازت جوتی سمیت گئے اور وہاں سے واپس ہو کر کہا کہ اگر یہ مسجد کا حصّہ ہوتا تو مجھے ضرور روک دیا جاتا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو مسلمانانِ کان پور اسی قابل تھے، اور ان کا علاج یہی تھا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ مہذب دنیا میں کیسا بھی کوئی مجسٹریٹ ہو شہادت پیدا کرنے کے لیے ایسا افسوسناک طریقہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اور بجز مسلمانوں کے کوئی اور قوم اس قسم کا سلوک گوارا نہیں کر سکتی۔ مسلمانانِ کانپور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے یہ ثابت کرنے کے لیے تیار ہیں کہ جس حصّۂ مسجد کو منہدم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس پر کبھی بھی جوتیاں نہیں گئیں بلکہ جب نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو یہاں نماز پڑھی جاتی ہے، بہر نوع جیسا کہ میں پہلے تار میں عرض کر چکا ہوں، ہر جگہ وضو گاہ مسجد کا لازمی حصّہ ہوا کرتی ہے اور جس قدر حرمت مسجد کے کسی اور حصّے کے لیے واجب ہے، اسی قدر حرمت وضو گاہ کے لیے بھی واجب آتی ہے!"

گورنر کا جواب ۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو سر جیمس مسٹن نے اس خط کا جو تار کے ذریعے بھیجا گیا تھا۔ اپنے دستخط کے ساتھ جواب بھیجا انھوں نے یہ گرامی نامہ نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس سے تحریر فرمایا تھا، اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اصل موضوع پر جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہی ہے کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے تحریر فرمایا تھا،

یقین فرمائیے اگر یہ شور وغل ٹل سکتا ہے، تو مجھے بہت مسرت ہوگی، مگر ہم سب کو اس امر سے اتفاق ہونا چاہیے کہ اگر ہم رفاہ عام کا خیال دل میں رکھتے ہیں تو ہمیں چھوٹی اور بڑی باتوں کے درمیان امتیاز کرنا چاہیے۔ اگر خفیف سے خفیف تکلیف کو قومی شکایت بنا دیا جائے اور اسے قومی شکایت تسلیم بھی کر لیا جائے تو حکومت کے قانون اور رفاہِ عام کی ترقی کا خدا ہی حافظ ہے، اگلے مہینے جب میں کانپور آؤں گا تو مسلمانوں سے ملاقات کروں گا، اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا، ان کی ناراضگی خاطر کو جس کا مجھے حقیقی صدمہ ہے دور کر دوں گا۔ مگر میں اپنے اس فیصلے کو کہ اے بی روڈ کے لیے مسجد کا دالان منہدم کر دیا جائے۔ تبدیل نہیں کر سکتا، میں آپ کا کچھ کم شکر گزار نہیں کہ آپ نے اس معاملے کو ایسی منصف مزاجی اور آزادی کے ساتھ میرے سامنے پیش کیا۔ ؟"

اس مدلل خط و کتابت کا اگر کوئی نتیجہ نکلا تو صرف یہ کہ سر جیمس مسٹن نے اس سلسلے میں علمائے کرام سے کوئی مشورہ نہیں کیا، نہ قانون داں اصحاب کی رائے معلوم کی نہ ضلع مجسٹریٹ بٹلر کی گوشمالی کی جس نے محض حکمراں قوم کا ایک فرد ہونے کے باعث جوتوں سمیت مسجد میں گھس کر ایک غلط قسم کی شہادت پیش کرنے کی جرأت کی تھی۔ نہ اسے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے جذبات اور احساسات دینی کا احترام کیا جائے۔ اگر کچھ کیا تو یہ کہ مسجد کے انہدام کا فیصلہ ایک واقعہ اور حقیقت بن گیا، اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت مسجد کے دفاع میں شہید اور زخمی ہو گئی، بہتوں پر مقدمہ چلا اور وہ جیل بھیج دیئے گئے۔

خواجہ حسن نظامی کی تقریر حادثۂ انہدام مسجد سے ہندوستان کے مسلمان کس درجہ دلگیر، متاثر اور سراپا جوش و خروش

بنے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو، راگست ۱۹۱۳ء کو بعد نماز جمعہ میرٹھ کی جامع مسجد میں انھوں نے کی تھی، خواجہ صاحب نے فرمایا:۔

"اس تلوار کی قسم جس پر آج غیر کا قبضہ ہے تو کل ہمارا ہوگا ہم کانپوری شہیدوں کے ماتم میں یہاں جمع ہوئے ہیں وہ مسجد جس سے محبت کرنے والے مسلمانوں کو دس منٹ لگاتار فائر کرکے خاک و خون میں ملادیا جس کے سامنے ہمارے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہوگئیں۔

اس مسجد کی قسم جس کے سامنے دم توڑنے والے شہیدوں نے کہا کہ سلام ہمارا مدینے والے سلطان پر جس کے دین کی لاج پر ہم اپنی جان دیتے ہیں۔ جس کے گیسو دراز نور سے حسنؓ و حسینؓ اس مقتل میں اپنی سُرخ و سبز قباؤں کے دامن بچھا رہے ہیں۔ جن کی صاحبزادی فاطمہ زہراؓ اپنے باپ کی امت کو پانی پلاتی پھرتی ہیں۔

اس مسجد کی قسم جس کے اندر سیکڑوں بے گناہ ستم کی رسیوں سے باندھے گئے اور بھوکے پیاسے جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کیے گئے۔

اس ملک میں کچھ انگریز ہیں جو کہتے ہیں کہ گنتی کے چند مسلمان اور اخبارات غل مچا رہے ہیں کاش وہ بدنصیب جانتے کہ اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں ایسی بجلی ہے جو انگریزوں کی تار کی تار برقی میں بھی نہیں پائی جاتی، اس میں ایک ایسی لہر ہے جو دنیا کے تمام سمندروں کی لہروں سے زیادہ پرجوش ہے۔ ان کو یقین کرنا چاہیے کہ سارا ہندوستان کانپوری

مسجد کے معاملے میں ایک دل اور ایک زبان ہے کیا یہ لوگ مسلمانوں کا جوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سے کہہ دو کہ ہمارا جوش فیشن اور نمائش کا جوش نہیں ہے۔ ہم جب جوش میں آتے ہیں تو آسمان تھرّا جاتا ہے۔ سمندر ڈر کے مارے سمٹ جاتا ہے۔ پہاڑ پست ہو جاتے ہیں۔ دریاؤں کی روانی رک جاتی ہے ہمارا جھنڈا جب بلند ہوتا ہے تو سینٹ پال کے گرجا کے سوا کہیں نصب نہیں ہوتا۔ ہماری مسجد کو بنا دو ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو ہمارے زخمیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔"

مسجد کانپور کا المیہ

(۲)

ابھی اس عنوان کے چند پہلو اور تشنۂ بحث و گفتگو ہیں:

حکومت کی غلط بینی حکومت نے یہ سمجھا تھا کہ مسلمان ہر اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ غدر میں انھیں اس طرح کچلا اور تباہ و برباد کیا جا چکا ہے کہ ان میں حکومت سے ٹکر لینے کی سکت نہیں، حکومت کچھ بھی کرے لیکن وہ اُف بھی نہیں کر سکتے۔

لیکن کانپور کی مسجد کے حادثۂ انہدام نے ثابت کر دیا کہ حکومت کا اندازہ غلط تھا۔ سیاسی حقوق و مراعات کے سلسلے میں وہ ناانصافی برداشت کر سکتے تھے حکومت کی خارجہ پالیسی سے متعلق بھی وہ تحمل سے کام لے سکتے تھے۔ مسلم حکومتوں سے حکومت نے جو سنگ دلانہ اور سفاکانہ رویّہ اختیار کر رکھا تھا اسے بھی کسی نہ کسی طرح سینے پر پتھر کی سل رکھ کر گوارا کر سکتے تھے۔

لیکن جب مذہب کا معاملہ آ جائے، خانۂ خدا کی حرمت کا سوال پیدا ہو شعائرِ دینی کا استخفاف کیا جانے لگے تو ہر طرح سے کمزور اور بے مایہ ہونے کے باوجود حقیر اور پس ماندہ مسلمان مر بھی سکتے تھے۔ خاک و خون میں لتھڑنا ایک کھیل تھا، ناموسِ ملی پر جان دے دینا ان کا سب سے اہم فریضہ تھا۔

لوگ زندگی کے مریض ہوتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے؟ کتنے اور کیسے جتن نہیں کر ڈالتے؟

لیکن دین کی حرمت کے موقع پر مسلمان زندگی سے بیزار اور موت کے حریص بن جاتے ہیں، پھر انھیں زندگی کی تمنا نہیں رہتی، موت کا دامن ہی ان کی بہترین پناہ گاہ بن جاتا ہے۔ انگریزوں نے اب یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اور اس احساس نے انھیں پیکر اضطراب و اضطرار بنا دیا تھا۔

حکومت کا پروپاگنڈا اور ہمدرد کا جواب

اس حادثے کی اہمیت کم کرنے اور اسے چند غلط لوگوں کا کارنامہ قرار دینے کی حکومت کے اعلانوں اور بیانوں میں کوشش کی گئی اور اس کی خوب تشہیر بھی کی گئی کہ عام مسلمان تو وفادار سرکار ہیں، انھیں شور و شر اور ہنگامہ و فساد سے کیا سروکار؟ یہ تو چند ہنگامہ پسندوں اور شورش برپا کرنے والوں کی شرارت ہے۔ ۷ راگست ۱۹۱۳ء کے مقالۂ افتتاحیہ میں روزنامہ ہمدرد نے اس "مفسدانہ" پروپاگنڈے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:۔

"مسٹر ٹیلر مجسٹریٹ کانپور کا بیان ہے کہ بیرونی اشتعالک اور طعنوں سے تنگ آکر مسلمانان کانپور نے بلوا کر دیا ——————

مگر مسٹر ٹیلر اور ان کے ہم خیالوں پر واضح ہونا چاہیے کہ سب سے بڑی اشتعالک مسلمانوں کو اگر کسی بات سے ہو سکتی تھی تو اس سے کہ باوجود ان کی فریاد، واویلا سرکاری اعلان میں یہ اشارہ کیا گیا کہ کانپور کے مسلمانوں میں دراصل کوئی سچا جوش مسجد کے متعلق نہیں ہے، اس کے معنی دوسرے الفاظ میں اور کیا ہو سکتے تھے کہ حکومت ان کی لفظی ناراضگی کی کچھ پرواہ نہیں کرتی، اور مسٹر ٹیلر اور ان کے ہمنوا اس بات کے آرزومند تھے کہ اس سے کچھ زیادہ بروے کار آئے، ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ان کی آرزو پوری ہوئی۔ مسٹر ٹیلر اپنی سرکاری رپورٹ میں ان واقعات کو خواہ کسی رنگ میں

رنگیں مگر شہیدانِ کانپور کے لہو کی سُرخی ہمیشہ کے لیے ان کے دامن پر جھلکتی رہے گی۔ اور ان بے گناہوں کا خون تا قیامت ان کی گردن پر رہے گا۔ مسلمانوں کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے متعلق اب سے پہلے بہت کچھ کہا جا چکا ہے، مگر جس حالت میں ان کی مودبانہ عرضداشت اور ان کی باضابطہ فریاد کو مسٹر بٹلر یہ طعنہ دے کر کہ ان میں کوئی حقیقی جوش نہیں ہے ان کی رگ غیرت و حمیت کو حدِ اعتدال سے زیادہ حرکت میں لانا چاہیں تو اگر ان سے کوئی امر خلاف قانون سرزد ہو تو محل استعجاب نہیں، مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بتاتی ہے کہ جس وقت ان کے معابد کی بے حرمتی کر کے ان سے چاہا جائے کہ وہ اپنے سچے مذہبی جذبات کا ثبوت دیں تو یاد رکھنا چاہیے انھیں اپنی جانیں اور گردنیں اپنی عبادت گاہوں سے زیادہ عزیز نہیں ہیں اور وہ اپنی چند روزہ زندگی کا اس سے بہتر کوئی خاتمہ نہیں سمجھتے کہ وہ خدا کی راہ میں کام آئے۔

کانپور کے ہنستے مسلمان اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ وہ مسلح فوج اور نیزہ بردار پولیس کے سواروں کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے، مگر جو حاکم اپنی شان "انا ربکم الاعلیٰ" اور اختیار "لمن الملک الیوم" کا اظہار کرنا چاہتا ہو۔ اس سے یہ کب توقع ہو سکتی تھی کہ وہ وقت اور موقع کی نزاکت کو ملحوظ رکھے گا۔ اگر مسلمانوں نے مسٹر بٹلر کے غیرت دلانے کی وجہ سے یا انہدام مسجد کو خلاف قانون سمجھ کر اسے دوبارہ درست کرنا چاہا تو مسٹر بٹلر کو کس بات نے تحریک کی کہ وہ مسلح پولیس لے کر ایک غیر مسلح جماعت پر حملہ کر دیں۔؟

ہاتھ کی سرخی کو مانا کہ حنا کہتے ہیں!
یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے انھیں کیا کہتے ہیں؟"

گورنر یوپی کی تقریر پر ہمدرد کا تبصرہ

مسلمان اس پر بضد تھے کہ منہدم شدہ حصۂ مسجد کی از سر نو تعمیر کی جائے۔ یہی مطالبہ وہ بار بار کر رہے تھے اور ہر مکتب فکر اس مطالبے میں برابر کا شریک تھا لیکن حکومت مسلمانوں کے زخم پر نمک پاشی کر رہی تھی۔ اور کسی طرح تلافی مافات پر آمادہ نہیں تھی۔ یو۔ پی (صوبجات متحدہ) کے لیفٹننٹ گورنر سر جیمس مسٹن نے بمقام آگرہ اس سلسلے میں جو تقریر کی اس میں نہ صرف تلافی مافات کی طرف اشارہ نہیں تھا، بلکہ اپنے سفاکانہ کارنامے پر فخر و امتنان کا اظہار بھی تھا۔

۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کے اداریے میں ہمدرد نے سر جیمس مسٹن کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

جناب والا قدر کی تقریر آگرہ سے عمر بھر میں پہلی مرتبہ ہم کو یہ معلوم ہوا کہ رسمِ عزاداری میں کشتگان محبت کے وارثوں سے الٹا گلہ بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سر جیمس مسٹن بالقابہ نے منجملہ ان امور کے جن پر جناب موصوف نے حیرت ظاہر کی ہے۔ ان لوگوں پر جنھوں نے دور رہ کر اور محفوظ رہ کر تقریروں اور تحریروں سے جاہل خلقت خدا کے جذبات میں آگ لگا دی اور جن پر خدا کی نظروں میں اور انسان کی نگاہوں میں اس بے ضرورت خوں ریزی برپا کرانے کا گناہ ہے، ہز آنر کی یہ حیرت بجا ہوتی اور ہم ان کے ساتھ متحیر ہونے کو تیار ہو جاتے بشرطیکہ ہمیں یقین ہوتا کہ واقعی کانپور سے باہر رہنے والوں نے دور رہ کر، اور محفوظ رہ کر تقریروں اور تحریروں سے جاہل خلقتِ خدا کے جذبات میں آگ لگا دی ہے۔

لیکن اب کہ حکومت نے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً مانگنے اور گلہ پھاڑ پھاڑ کر مانگنے کا سبق از بر کرا دیا ہے اور اب کہ مسلمان بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ

ہمارے فرمانروا حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم، دروازہ پر دستک دے اور وہ تجھ پر کھول دیا جائے گا!

پر شد و مد کے ساتھ کاربند ہیں، اور ہم سے بھی اسی تعلیم کی پیروی کرانا چاہتے ہیں ہم افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مسلمان اس سبق کو کبھی نہیں بھولیں گے اور جب تک ان پر دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ اسے برابر کھٹکھٹاتے رہیں گے، خواہ دروازہ کھلنے کے بعد ان پر گولیوں کی بوچھار یا پھولوں کی بارش کیوں نہ ہو۔

ہز آنر نے تقریر کا خاتمہ دعا پر کیا ہے جس میں آگرہ کے متعلق یہ خواہش کی گئی ہے کہ وہاں اس قسم کا کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ ہم کو ہز آنر کی اس دعا سے کلی اتفاق ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی دعا ہے، کہ آگرہ کی کسی مسجد کا وہ حشر نہ ہو جو کانپور کی مسجد مچھلی بازار کا ہو چکا ہے۔"

گورنر یوپی کی خدمت میں وفد اور میمورنڈم

اب تک مسلمانوں نے مسجد کی تعمیر سے متعلق جتنے مطالبات کیے وہ رد کر دیے گئے۔ جتنی عرضداشتیں پیش کیں انھیں مسترد کر دیا گیا۔ جتنی فریادیں کیں انھیں مستحق سماعت نہیں سمجھا گیا۔ آخر آمنے سامنے بیٹھ کر ان کی انسانیت، شرافت اور عالی حوصلگی سے اپیل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس مقصد کے لیے یوپی کے سب سے بڑے تعلقہ دار اور بہت بڑے قومی رہنما راجہ سر علی محمد خاں والیٔ محمود آباد کی قیادت میں ایک وفد مرتب کیا گیا۔

۱۶ر اگست ۱۹۱۳ء کو ۱۱ بجے ہز آنر لیفٹننٹ گورنر صوبجات متحدہ کی خدمت میں بمقام گورنمنٹ ہاؤس یہ وفد باریاب ہوا اور جو میمورنڈم لیفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا اس کے اہم حصے یہ ہیں:

"ہم سب سے پہلے حضور کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ مسجد زیر بحث کے

قریب والے مندر کی خوش قسمتی پر ہماری قوم کو کسی قسم کا صدمہ نہیں ہے۔
ہمارا خیال ہے کہ مندر کا بچانا ضروری تھا اور بہت مناسب ہوا کہ وہ بچا لیا گیا۔
نومبر ۱۹۱۲ء میں مسلمانان کانپور نے حضور کے اس ارشاد کو کہ مسجد (بھی) کلیتہً بچالی جائے گی (مندر کی طرح) مسلمانوں نے اطمینان بخش سمجھا۔

مارچ ۱۹۱۳ء کو بورڈ (بلدیہ) نے جو تجویز منظور کی، یہ تھی کہ:۔
"حکومت سے سفارش کی جائے کہ مسجد کا کوئی حصہ مسلمانوں کے جذبات کے لحاظ سے نہ لیا جائے!"

بورڈ کے چیرمین نے صاحب کلکٹر کے توسط سے یہ تجویز حکومت کی خدمت میں بھیج دی، مگر ساتھ ہی یہ ریمارک بھی درج کر دیا کہ:۔
"میں اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا!"

چنانچہ حکومت نے بورڈ کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا

اسی اثنا میں کانپور کے مسلمانوں کا ایک وفد کلکٹر ضلع کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس کے بعد شیخ شاہد حسین (تعلقہ دار) کے ذریعہ سے حضور کی خدمت میں ایک میمورنڈم بھیجا گیا لیکن وہ مئی کی ۱۷ تاریخ کو مسترد کر دیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانان کانپور کی طرف سے راجہ صاحب محمود آباد کے ذریعہ ایک میمورنڈم حضور کی خدمت میں بھیجا گیا۔ مگر اس کا جواب حادثۂ انہدام کے بعد انھیں ملا۔

یور آنر،!

منہدم حصے کے تقدس کا سوال بالکل اسلامی شرع کا قانون ہے، علاوہ ازیں علمائے کرام کے فتوے بھی ہماری تائید میں ہیں۔ ان امور کو مدنظر رکھ کر ہم پورے زور اور متانت کے ساتھ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ

منہدم شدہ حصہ مقدس تھا، اور مسجد کا جزو تھا۔

یور آنر ہمیں معاف کریں گے اگر ہم مسئلے کے اس حصے پر ذرا آزادی اور جوش کے ساتھ گفتگو کریں، ہمیں یہ دیکھ کر رنج ہوا ہے کہ عوام کے سامنے (حکومت کی طرف سے) ایسے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے ہمارے مذہبی خیالات کی ہتک ہوتی ہے۔ یہ جذبات اصلی ہیں، اور ہمارے ایمان کی چٹان پر قائم ہیں۔

ہم یور آنر سے نہایت ادب اور جوش کے ساتھ التجا کرتے ہیں کہ مسجد کے منہدم حصہ کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے!"

ارکانِ وفد

اِس ایڈریس پر جن حضرات کے دستخط تھے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

(۱) حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی۔
(۲) آنریبل راجہ سر علی محمد خاں کے سی آئی ای، دائی محمود آباد۔
(۳) آنریبل راجہ سید تصدق رسول خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد۔
(۴) آنریبل راجہ میر امیر جعفر، تعلقہ دار، پیر پور۔
(۵) نواب محمد اسحاق خاں (نواب اسمٰعیل خاں کے والد۔
(۶) نواب مزمل اللہ خاں، آف بھیکم پور۔
(۷) آنریبل مسٹر عبدالرؤف سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ،
(۸) آنریبل مسٹر شاہد حسین تعلقہ دار۔ پاکستانی فضائیہ کے مشہور افسر۔ فواد شاہد حسین کے والد ماجد۔
(۹) آنریبل خواجہ غلام الثقلین،
(۱۰) آنریبل مسٹر (بعد میں سر) سید رضا علی۔
(۱۱) مسٹر سید نبی اللہ بیرسٹر ایٹ لاء آگرہ۔

(۱۲) نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔

(۱۳) مولوی محمد نسیم ایڈوکیٹ ۔ پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل مسٹر محمد وسیم کے والد ماجد۔

(۱۴) منشی احتشام علی صاحب، رئیس کاکوری۔

وفد کی کارروائی کا خلاصہ

اس وفد سے متعلق، ۲۱ اگست ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں جو کارروائی شائع ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"راجہ صاحب محمود آباد جب ایڈریس سنا رہے تھے تو بہت متاثر نظر آرہے تھے"

ایڈریس کے اختتام پر مسٹر نبی اللہ نے کہا:

اور میرے خیال میں عدالت دیوانی کے روبرو ہمارا یہ مقدمہ بہت جلد کامیاب ہو سکتا ہے۔"

مسٹر عبدالرؤف (سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ) نے فرمایا:۔

"ہم یہاں دیوانی یا فوجداری قانون کے متعلق اپنے حقوق پر بحث کرنے نہیں آئے ہیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ لیفٹننٹ گورنر مسلمانوں کے جذبات کا خیال، اور ان کی درخواستوں پر غور کریں۔"

مسٹر رضا علی نے کہا:۔

"میں یہ نکتہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آیا وضو خانہ مسجد کا اصلی اور ضروری جزو ہے کہ نہیں، اسلامی شرع میں "ضروری جزو" کے الفاظ نہیں پائے جاتے، بلکہ تمام مسجد یکساں طور پر متبرک اور مقدس سمجھی جاتی ہے، خواہ وہ غسل خانہ ہو یا منبر، یا کوئی اور حصہ، اور مسجد کے کسی حصہ پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔"

راجہ صاحب جہانگیر آباد اور شیخ شاہد حسین نے کہا۔

"ہم سب مرحمت خسروانہ کے متمنی، اور خواستگار ہیں!"

اس وفد میں ہندوستان کے چوٹی کے مسلمان شریک تھے اور شاید سب سے

پہلی مرتبہ حکومت کے ایک اقدام کے خلاف، شکایت احتجاج اور بیزاری کا اظہار کرنے والوں میں مسلمان تعلقہ دار طبقے کے بھی، نمائندے موجود تھے اور راجہ صاحب محمود آباد تو اپنے تعلقے کی وسعت، آبادی اور آمدنی کے اعتبار سے ایک اچھے خاصے والئ ریاست کے ہم پایہ تھے۔ لیکن مذہبی جوش نے آج انھیں صوبے کے سب سے بڑے آمر اور حاکم کے سامنے اظہار شکایت کے لیئے لاکھڑا کیا تھا۔

یہ ایڈریس جو مسٹر جیمس مسٹن کی خدمت میں پیش کیا گیا سنجیدہ، مدلل اور متوازن تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسی سڑک پر مندر کی خاطر سڑک ٹیڑھی کردی گئی۔ اور مسجد کو ہدف ستم بنایا گیا۔ ہند و مسلم منافرت کی آگ کو ہوا دینے کے لیے اس سے زیادہ اور اس سے اوچھی کوئی اور تدبیر نہیں ہوسکتی۔ لیکن ایڈریس میں برطانوی حکومت کے مکر و فریب، اور سازش کا قلعہ مسمار کردیا گیا۔ کیونکہ ارکان وفد نے نہ صرف یہ کہ اس کی کوئی شکایت نہیں کی کہ مندر کو مسجد پر ترجیح دی گئی بلکہ اس بات پر اظہار امتنان و مسرت کیا کہ مندر کو منہدم ہونے سے بچا لیا گیا۔ اس ایڈریس کا جواب ایک عقیل و فہیم حکمراں کی طرف سے یہی ہوسکتا تھا کہ،

جھکی ذرا چشم جنگ جو بھی ، نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

وفد کو گورنر یوپی کا جواب

لیکن سر جیمس مسٹن، صرف حاکم نہ تھے آقا بھی تھے، ان سے اس معقولیت کی توقع ہی بیکار تھی،

اس ایڈریس کے جواب میں ہز آنر لیفٹنٹ گورنر نے جو کچھ فرمایا۔ بہت خوب فرمایا نامناسب نہ ہوگا، اگر اس کے ضروری حصے پیش نظر رہیں۔

"آپ کی درخواست یہ ہے کہ منہدم شدہ غسل خانے کی دوبارہ تعمیر کا حکم دے دوں، جیسا کہ میں نے آپ سے کہا ہے میں ہمیشہ آمادہ رہا ہوں اور اب بھی آمادہ ہوں کہ مسجد کے شمال کی طرف ایک قطعہ زمین قانونی کارروائی اور وقف کے اصول کے مطابق دے دوں یہ ٹکڑا غسل خانے کے لیئے کافی سے زیادہ ہوگا۔ نمبر ۱۳۱ [illegible]

کو اس کی تعمیر کے لیے کافی رقم دے دوں۔ میری طرف سے پیشکش پہلے بھی ہو چکی ہے۔ اور اب بھی موجود ہے۔

لیکن اگر آپ کی درخواست کا یہ منشا ہے کہ غسل خانہ اس قطعۂ زمین پر دوبارہ تعمیر کیا جائے جو حاصل کر لی گئی ہے۔ تو اس مسئلے کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس قسم کا کوئی حکم دینا میرے لیے ناممکن ہے، افسوس کا اظہار میں نے ازراہ تصنع نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ آج میں اپنے سامنے بہت بڑے دوستوں کو دیکھتا ہوں، جن کی رائے کی بڑی قدر کرتا ہوں، اور جن کی دس نصیحتوں میں سے چار میں ضرور مان لوں گا۔ لیکن اس معاملے میں مجھے وسیع انتظامی امور کا لحاظ کرنا ہے، جو قانون اور ضابطے کے قیام کے لیے بے حد ضروری ہیں اور جنھیں نظر انداز کر دینے کو بدنظمی اور اندھیر کہیں گے۔

آپ حضرات کی طرح میں بھی ۱۳ اگست کے حادثے پر بحث نہیں کر سکتا جو عدالت میں زیر سماعت ہے، لیکن بغیر اس کے کہ عدالتی تحقیقات کے نتائج کے بارے میں پیش گوئی کی جائے یہ میرا فرض ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھوں کہ حکومت زور اور زبردستی کی باتوں کو نہیں مان سکتی!"

گورنر کے جواب پر ہمدرد کا اداریہ

ایڈریس کا جواب جو سر جیمس مسٹن نے دیا۔ اس پر روزنامہ ہمدرد نے ۲۱ اگست ۱۹۱۳ء کو جو ادارتی نوٹ لکھا اس کا ایک حصہ یہ ہے!

"جہاں تک ہز آنر کی تقریر سے مترشح ہوتا ہے، یہ ہے کہ اگر اس واقعے کے بعد حکومت نے اپنا حکم واپس لے لیا تو اسے اس کی کمزوری پر محمول کیا جائے گا، غالباً یہ سبق ہز آنر کو تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد حاصل ہوا ہے، مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہز آنر اس طریقے سے مسلمانوں کو کچھ اور سبق دے رہے ہیں،

یہ کہنا کہ حکومت بزور کسی بات کو نہیں مان سکتی، واقعات کو چھپانا

ہے۔ ہم نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو دیکھا کہ کس طرح بعض اوقات بڑے سے بڑے حکام بھی زور کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان چند نفوس میں غالباً ہز آنر بھی ہوں گے جن کو دربار کے تغیرات کا علم پہلے سے تھا، مگر شاید یاد نہیں ہز آنر کی یہ پالیسی کہ کوئی بات حکومت کو بہ زور نہیں ماننی چاہیئے، اس وقت کہاں سوئی ہوئی تھی؟ یا ہم یہ سمجھیں کہ جس زور کو حکومت تسلیم نہیں کرتی وہ کسی اور قسم کا زور ہے، اور جس زور کو وہ تسلیم کرتی ہے وہ کسی اور طرح کا ہے؟

مسلمانوں کے لیے یہ کہنا کہ وہ کسی بات کو بہ زور منوانا چاہتے ہیں ایک صریح بہتان ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ کون سی مسلح پولیس اور نیزہ بردار سوار ان کے ساتھ گئے تھے اور جن کے بھروسے پر ارکان وفد ہز آنر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور جن کے مقابلے پر سینہ تان کر کھڑا ہو جانا ہز آنر نے بھی اپنے لیے باعث فخر سمجھا؟ غریب مسلمانوں کے پاس اس سے زیادہ اور کیا زور ہے کہ:

بہت سعی کیجئے تو مر رہیئے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اور انھوں نے یہ کر دکھایا، اگر ہز آنر کا اشارہ اسی زور اور زبردستی کی طرف ہے جس کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے سوار اور پیدل فوج اور بے شمار پولیس لا کھڑی کرنا اپنے اقتدار کے لیئے ضروری سمجھتے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے یہ اقتدار کب تک قائم رہے گا؟ ہز آنر کے لیے مناسب ہے کہ ضد اور ہٹ سے باز آجائیں۔ انصاف کا خون نہ کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ رعایا ان کے افعال کو کس نظر سے

دیکھ رہی ہے ؟

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ؟

ہز آنر کی پوری تقریر میں جتنے دلائل انہدام جزو مسجد کے بجا ہونے پر پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے دو اپیلیں بہت وزنی خیال کی جاتی ہیں :

(۱) لکھنؤ میں کسی گمنام مسجد کا ایک حصّہ اسی طرح منہدم کیا گیا، مگر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

(۲) غسل خانہ اور وضوخانہ اس قدر متبرک نہیں ہیں جتنے مسجد کے دوسرے حصّے۔

لکھنؤ کی مسجد کے انہدام کے متعلق تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ مساجد کا احترام تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہ حکام نے اکثر ایسی مسجدوں کو ڈھایا اور کسی نے دم نہیں مارا، حکام کی زبردستی اور رعایا کی بے بسی ثابت کرتا ہے، اور اسے سند میں پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک قاتل اپنی بریت میں یہ دلیل دے کہ وہ اس سے پہلے بھی قتل کا مرتکب ہو چکا ہے، اور کسی نے اس کی گرفت نہیں کی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ سیاست برطانیہ کے حامی سر جیمس مسٹن اس قسم کے دلائل پیش کر کے حکومت کے کس پہلو کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں ؟

دوسری بحث تقدس کے مدارج کے متعلق ہے جس کی بابت شاید ہز آنر یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ایک خط منبر سے صحن مسجد میں ہوتا ہوا دروازوں اور سیڑھی تک کھینچا جائے تو جن حصوں سے یہ خط گذرے گا وہ بہ ترتیب درجہ تقدس سے گرتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ جب وہ خط غسل خانے اور

وضو خانے تک پہنچے گا تو اس کا احترام اتنا کم ہو جائے گا کہ جس وقت ہز آنر چاہیں، بٹلر (مجسٹریٹ) جیسے لوگوں کو شہادت اور اپنے اجتہاد پر محض ایک سڑک کی زیبائش کے لیئے اسے منہدم کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک احاطۂ مسجد کا ہر حصّہ ویسا ہی محترم ہے جیسا کہ منبر، اور اس کی ایک ایک اینٹ کو وہ اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جیسے دل و جگر کو، ہز آنر اگر اس کے مقر ہیں کہ ان کے حکم سے لکھنؤ کی کسی مسجد کا کوئی حصّہ منہدم کیا گیا تو ہز آنر کو واضح ہونا چاہیئے کہ ان کا یہ فعل اس بات کی شہادت میں پیش کیا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کے درپے ہیں اور اس پر جداگانہ باز پرس کی جائے گی اس لیئے کہ ایک خلاف قانون فعل کی سند دوسرے خلاف قانون فعل سے نہیں دی جا سکتی۔

وفد کی درخواست نامنظور کرنے میں ہز آنر نے سب سے زبردست بات جو اپنے تردیک کہی ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کی دوبارہ تعمیر سے حکومت کی کمزوری ثابت ہوگی۔ شاید انھیں لارڈ مارلی کا یہ قول یاد نہیں ہے کہ سچی طاقت اس بات میں نہیں کہ انسان اپنی کمزوری پر ہمیشہ پردہ ڈالتا رہے، کہ لوگوں پر اس کی غلطی عیاں نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں تو بے چینی کا یہ علاج تھا جو صوبہ جات متحدہ کے سیاسی طبیب (لیفٹننٹ گورنر) نے کیا۔ اور کہا مگر اہل، آئرلینڈ باوجود اپنی طبعی شورہ پشتی اور عملی قانون شکنی کے حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ آب و ہوا کا اختلاف یا جغرافیائی حیثیت ہو۔ یا یہ ہو کہ ہز آنر کے وطن سے اہل آئرلینڈ زیادہ قریب رہتے ہیں؟"

"ہمدرد کے اداریے کا اقتباس ذرا طویل ہو گیا۔ جس کے لیئے معذرت خواہ

ہوں، لیکن اسے میں نے اس لیئے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے اندازہ کرسکیں آج سے نصف صدی پہلے جب برطانوی حکومت اپنے عروج و شباب پر تھی، ہمدرد نے کتنی جرأت اور دلیری کے ساتھ صوبے کے سب سے بڑے حاکم پر انتہائی شدید اور تلخ نکتہ چینی، نتائج اور مواقب سے بے پرواہ ہو کر کی، اور اس کا یہ شعار آخر وقت تک قائم رہا۔

علامہ شبلی کی ایک نظم

شاید یہی موقع تھا جب ایک بہت بڑے عالم دین یعنی علامہ شبلی نے فرمایا تھا:

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بہرِ ہجوم
گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسین
سب یہ کہتے تھے قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم
جا بہ جا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہوگی معدوم
واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم

بعض مزید اہم مباحث آئندہ باب میں پیش کیئے جائیں گے!

حادثۂ کانپور — چند مزید گوشے

گذشتہ ابواب میں مچھی بازار کانپور کی مسجد کے انہدام اور اس سے متعلقہ مباحث پر گفتگو کر چکا ہوں۔ لیکن یہ گفتگو ابھی مزید چند ابواب تک جاری رہے گی۔ بہ ظاہر یہ ایک الم انگیز حادثہ تو ہے لیکن کچھ بہت زیادہ غیر معمولی نوعیت کا نہیں لیکن میرے نزدیک یہ حادثہ تاریخ ساز نوعیت اور حیثیت کا حامل ہے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی فکری، سیاسی اور ملّی شعور کی تاریخ میں یہ حادثہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ حادثہ رونما نہ ہوتا تو شاید ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں میں فرنگی سامراج سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہ پیدا ہوتا۔ وہ بزدلی نیاز مندی اور غیر مشروط اطاعت کی زندگی بسر کرتے رہتے، لیکن اس حادثے نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خوابِ خرگوش سے جاگ اُٹھے، ان میں مرنے، اور مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ سنگینوں کے سامنے وہ سینہ کھول کر کھڑے ہوگئے گولیاں انھوں نے پیٹھ پر نہیں دل پر کھائیں۔ خاک و خون میں تڑپے اور جامۂ شہادت پہن کر حیاتِ جاودانی حاصل کرلی، کوئی واقعہ اور کوئی حادثہ بھی انھیں اتنا بیدار نہیں کرسکتا تھا جتنا اس واقعے نے کیا۔ کسی بات سے بھی ان میں یہ جرأت نہیں

پیدا ہو سکتی تھی ۔ جو اس حادثے سے پیدا ہوئی ۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں مسلمانوں کا قید و بند اور دار و رسن کا معاملہ اس جہاد، بیداری اور شعور کا دیباچہ تھا، جو تحریک خلافت کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا ہے ۔

ہر زمانے میں اور ہر قوم میں غدار، مفاد پرست، طالع آزما اور قوت کے پرستار موجود رہتے ہیں ۔ حادثۂ انہدام مسجد کے زمانے میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی، لیکن عمومی طور پر اور مجموعی حیثیت سے عوام اور خواص میں جو جذبہ پیدا ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اس داستان کو بسط و تفصیل سے بیان کرنے پر میں اپنے تئیں مجبور پاتا ہوں ۔ جب تک یہ پوری داستان سامنے نہ ہو مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملّی شعور کا صحیح مرقع نظر کے سامنے نہیں آسکتا۔ لہٰذا اس سلسلے میں چند مزید ابواب آپ کو ملاحظہ کرنا پڑیں گے ۔

قیدیوں اور زخمیوں کی حالت

مسلمانوں کے قتل و خون کی داستان گذشتہ اوراق میں بیان ہو چکی ہے اب ذرا کان پور کے قیدیوں اور زخمیوں کا نظارہ کر لیجیے ۔

۲۸ اگست ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ہمدرد میں اس کے وقائع نگار خصوصی کا ایک مکتوب شائع ہوا تھا جس کے خاص خاص حصّے درج ذیل ہیں ۔

"آج میں اور شیخ ذکاء الرحمان صاحب وکیل سول سرجن کی کوٹھی پر پہنچے ۔ صاحب بہادر حاضری ۔ ناشتہ ۔ تناول فرما رہے تھے ۔ ہم اطلاع کر کے ان کے دفتر میں بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر تو چھری کانٹے کی آواز آتی رہی ۔ اس کے بعد ہم چشم براہ ہوئے کہ صاحب بہادر اب آتے ہیں، لیکن آنکھیں انتظار کرتی رہیں، کان آہٹ نہ سن سکے، پون گھنٹے کے بعد صاحب موصوف

تشریف لائے۔ خندہ رو ہو کر ہاتھ ملایا، اور عذر کیا۔

"میں بھول گیا تھا معاف کیجیے"

ہم نے بھی حقِ تہذیب ادا کرتے ہوئے بادل نخواستہ کہا۔

کوئی بات نہیں۔

صاحب موصوف نے پوچھا "میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ہم نے عرض کیا:۔

"جیل میں ملزموں اور شفا خانوں میں زخمیوں سے ملنا چاہتے ہیں! اور آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں!۔"

"اُنھوں نے اجازت نامہ لکھ دیا۔ جیل پہنچے تو خلقت کا انبوہ دروازے پر کشمکش میں مبتلا تھا۔ محمد عثمان صاحب سوداگر نے ہمارا اجازت نامہ داروغۂ جیل تک پہنچا دیا ہم نے پہلے شفا خانے میں مجروح بھائیوں کی تیمارداری کو ترجیح دی۔ مسٹر عثمان ہمارے ساتھ تھے۔ مجروحین میں سب سے پہلے دو غریب برآمدے میں پڑے ملے۔ ان میں سے ایک کا نام اُمید علی ہے۔ بیچارے کے بہت ضربیں آئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بندوق کے چھروں اور نیزے کے کچوکوں نے خوب ارمان نکالے ہیں۔ جگہ جگہ سے اس کا جسم چاندماری بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر خود بخود دل پگھلنا جا رہا تھا، ہم نے پوچھا۔

"کہو بھائی کیا حال ہے۔؟"

غریب پھوٹ پڑا، بدن کانپنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

دوسری جانب ایک اور صاحب ماتھے پر پٹی باندھے لیٹے تھے (علاوہ ازیں) کئی اور بوڑھے اور کم عمر کے زخمی لیٹے ہوئے تھے۔ سب سے بات چیت ہوئی۔ ہم نے سب کو ڈھارس دی۔ سب نے ہمارا اور ان بزرگانِ قوم کا شکریہ ادا کیا جو کان پور میں

ان کی تیمارداری اور قانونی پیروی کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر اور سکھ چین ترک کر کے یہاں آئے ہوئے تھے، یہ سب زخمی تھے، مصیبت زدہ تھے، بال بچوں سے علیٰحدہ تھے۔ مگر اپنے حال پر صابر و شاکر تھے۔ ان قومی مجرموں میں دو لڑکوں کی حالت خصوصاً قابلِ ذکر اور واجب الرحم ہے۔ نور الٰہی اور اشفاق الٰہی۔ دونوں سگے بھائی نیزوں اور بندوقوں کے بے درد حملوں سے لہولہان ہوئے۔ اشفاق کوئی دس بارہ برس کا ہوگا۔ آخر کار بے چارہ قادر ذوالجلال کے عرش کے نیچے شہید دل میں جا ملا۔ بڑا بھائی نور الٰہی ابھی بیمار ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب جنھوں نے ابتدا ہی سے جملہ زخمیوں کی مرہم پٹی نہایت دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ کی۔ فرماتے ہیں" اگر یہ بچہ جاں بر بھی ہوگیا تو اس کا دماغ صحیح نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس کے ماتھے پر متعدد چھرّے لگے ہیں اور دماغ پر اثر پہنچ چکا ہے غریب اکثر بے ہوشی کی حالت میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہوش میں آتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے۔

"اماں، ابّا جی، مجھے کروٹ دو!"

اسی حالت میں کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد بھی کرنے لگتا ہے۔ اس سے دریافت کیا جاتا ہے۔

"چوٹ کیسے لگی؟"

جواب دیتا ہے:۔

"مجھے خدا کے راستے میں چوٹ لگی ہے!"

میرے سامنے بھی وہ ہوش میں آیا، اور دل ہلا دینے والی آواز میں پکارنے لگا، "ابّا جی کروٹ دے دو!"

ہم اس صدائے دردناک کی تاب نہ لا سکے، کمرے سے باہر نکلے تو آگئے، امیّد علی

مجروح مذکور الصدر کے پاس ڈاکٹر عبدالصمد صاحب اور ایک اور ڈاکٹر کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی جاں بری کی کچھ کم امید ظاہر کی۔ کیونکہ چھرے پھیپھڑے میں بیٹھ گئے ہیں اور سوزش پیدا ہوگئی ہے۔

آخر میں ہم جیل پہنچے۔ سردار گینڈا سنگھ داروغہ جیل آگے بڑھے، داروغہ صاحب (دوسرے) آدمیوں کو روک کر ہمیں اندر لے گئے۔ اسیر سلاخوں سے جھانک رہے تھے۔ مصافحہ کے لیے ہاتھ نکلنے شروع ہوئے۔ معانقہ تو ہمارے سینوں کے بجائے سنگین سلاخوں نے کیا۔

سب سے تسلی و تشفی کی باتیں کرتے ہوئے مولانا آزاد سبحانی کے قفس کی آہنی تیلیوں کے سامنے پہنچے۔ انھوں نے نہایت اشتیاق اور خندہ پیشانی کے ساتھ سلاخوں کے اندر سے ہاتھ نکالے۔ ہم نے ان بے گناہ ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ اور دل و جگر کو حسرت رہی کہ حافظ احمد اللہ اور مولانا محمد سعید کے ہاتھ چومتے یہ سب حضرات بالکل شادماں نظر آتے تھے۔

ہم نے ان سے عرض کیا:۔

"قوم کی آنکھیں آپ صاحبوں پر لگی ہوئی ہیں!"

انھوں نے نہایت وقار اور استقلال سے فرمایا:

"اسلام زندہ ہے، اس کے سچے شیدائیوں کی ہمیشہ آزمائشیں ہوتی رہتی ہیں، امید ہے خدائے کریم اپنے فضل و کرم سے ہمیں اور ہماری قوم کو اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے گا!"

آخر ہم قادر مطلق کی عظمت و جلال کو یاد کرتے ہوئے واپس آگئے۔"

اس مکتوب میں دو شخصیتوں کا ذکر آیا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان کا تعارف کرا دیا جائے۔

ڈاکٹر عبد الصمد کانپوری کانپور کے بہت پرانے قومی کارکن اور ہمدرد خلائق معالج ہیں۔ کانپور کے ہندو مسلمان ہر فرقے کے لوگ ہمیشہ ان کی صداقت، انسانیت اور شرافت کے ثناخواں اور تعریف میں رطب اللسان رہے اور اب تک وہ انھیں فراموش نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب کہن سالی کے باوجود اب تک خدا کے فضل سے اچھی صحت کے مالک ہیں۔ عرصہ ہوا ترک وطن کر کے پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔ بندر روڈ پر ان کا مطب ہے اور خلقِ خدا کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کے صاحبزادگان بھی اسی جذبے سے سرشار ہیں اور اپنے آبائی پیشے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ یہی حال ان کی صاحبزادیوں کا ہے

مولانا آزاد سبحانی بڑے پائے کے عالم تھے، فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ مدرسہ الٰہیات کے نام سے کانپور میں جو یگانہ اور منفرد علمی درس گاہ قائم کی تھی یہ اس کے صدر مدرس تھے۔ سیاست سے انھیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اپنا اصل وطن گورکھپور چھوڑ کر کانپور میں اسی درسگاہ کی خدمت کے لیے آئے۔ مسجد و درس گاہ ان کی دنیا تھی۔ اس دنیا سے باہر نکلنے کی نہ انھیں آرزو تھی نہ ہوس لیکن مسجد کے حادثۂ انہدام نے انھیں باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک مجاہد کی شان سے باہر نکلے اور حکومت کے خلاف انھوں نے اپنی سحر انگیز خطابت سے آگ لگا دی، ایسا شوق شہادت پیدا کیا کہ ہر شخص اسی جذبے سے سرشار نظر آنے لگا۔ میں نے ان کی خطابت کو سحر انگیز کہا ہے۔ اور یہ قطعاً مبالغہ نہیں ہے، ان کی تقریروں میں واقعی جادو کا اثر تھا۔ بڑے سے بڑا مجمع دم بخود ہو کر ان کی تقریر سنتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بے پناہ خطابت کا اگر کامیابی کے ساتھ کوئی مقابلہ کر سکا تو وہ صرف مولانا آزاد سبحانی تھے۔ جو لوگ ان کے افکار و خیالات کے بدترین مخالف تھے اور ان پر تند و تلخ لہجے میں نکتہ چینی کیا کرتے تھے

وہ بھی مولانا کے رنگِ خطابت سے اتنے مسحور تھے کہ ان کی کوئی تقریر ناغہ نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ — یہ میری طالب علمی کے زمانے کا واقعہ ہے — دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسۂ میلاد النبیؐ کے مقرر خصوصی مولانا آزاد سبحانی تھے، وہ آئے اور خطابت کے لعل و گوہر بکھیرنے لگے۔ سارا مجمع دم بخود تھا، عالم بھی اور عامی بھی تھے یہ نہرو رپورٹ کا زمانہ تھا۔ مولانا اس کے مخالفین میں تھے۔ اور الناظر کے مدیر شہیر مولانا ظفر الملک علوی اس کے ثناخوانوں میں تھے اور ان لوگوں پر بے دردی سے نکتہ چینی کر رہے تھے۔ جو نہرو رپورٹ کے مخالف تھے، دوران تقریر میں کسی کام سے میں نے ہال سے باہر قدم نکالا تو دیکھتا کیا ہوں مولانا ظفر الملک علوی خلاف معمول نہایت تیزی کے ساتھ سائیکل پر رواں دواں تشریف لا رہے ہیں۔ میرے ان کے خوردانہ اور بزرگانہ تعلقات تھے۔ میں نے لپک کر استقبال کیا اور پوچھا:

"مولانا خیر تو ہے، آپ تو جیسے ہوا پر اُڑے چلے آ رہے ہیں!"

مولانا نے فرمایا:

"ہاں بھئی میں اس شخص کی تقریر کے لطف سے محرومی گوارا نہیں کر سکتا — کیا تقریر شروع ہو گئی؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ مولانا نے سائیکل مجھے تھمائی اور تیزی سے ہال میں داخل ہو گئے۔

یہی کیفیت میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے عہد طالب علمی میں دیکھی۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (موجودہ نائب صدر بھارت) ڈاکٹر عابد حسین پروفیسر محمد مجیب (آکسن) اور دوسرے اساتذہ اور عمائد شہر ہمہ تن متوجہ ہو کر، فکری اختلاف کے باوجود بے خودی کے عالم میں ان کی تقریر سنتے تھے۔

مولانا صحیح معنی میں درویش تھے۔ گاڑھے کی ایک تہہ بند، اسی کا کرتا۔ اسی کی چادر، لکڑی کی کھڑاؤں، یہ تھا ان کا حلیہ اور ان کی شان، اسی عالم میں سارے ملک کا دورہ کرتے تھے۔

مولانا نے آخر میں روس اور امریکہ کی سیر بھی کی۔ ۱۹۴۷ء میں بمبئی میں ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ جب کہ امریکہ سے واپس تشریف لائے تھے۔ تقسیم کے بعد انھوں نے بھارت کے قیام کو ترجیح دی۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کام کرتے رہے۔ چند سال ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حادثۂ کانپور اور عافیت پسند

(۱)

برطانیہ کی سرکار دولت مدار کے خلاف نیاز مند، اطاعت کیش اور وفادار مسلمانوں کا مذہبی جہاد، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، ایک طرف جیمس مسٹن کی قہرمانیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وزیر ہند اور وزرائے برطانیہ کو انہدام مسجد سے متعلق مسلمانوں کے جذبات و تاثرات سے روشناس کرانے کے لیے محمد علی اور وزیر حسن لندن گئے تو "ایم علی" اور "ڈبلیو حسن" کے نام سے، ورنہ اندیشہ تھا کہ ساحل سمندر سے

دست بدستے دگرے، پا بدستے دگرے

واپس لائے جاتے، ہاں تو ایک طرف سر جیمس مسٹن کی قہرمانیت تھی۔ جو استبداد کے سوا کسی چیز کی قائل نہ تھی، معاملہ فہمی، رواداری اور عالی ظرفی جیسی چیزوں کا اس کے حصار فکر میں داخلہ ممنوع تھا۔ دوسری طرف نہتے اور عرصۂ دراز کے کچلے ہوئے مسلمان تھے جو دین کی حرمت پر کٹ مرنے کو تیار تھے۔ تیسری طرف راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو سرسید کی پالیسی سے منحرف ہوکر علی الاعلان استبداد اور قہرمانیت کے اس پیکر کو للکار رہے تھے۔

عام مسلمانوں کا جذبۂ ایثار عامۂ مسلمین کے جذبات اور عواطف کا اس سے اندازہ

ہوسکتا ہے کہ ہمدرد نے اپنے خاص نمایندے کو عید کے موقع پر ماتم کدۂ کانپور کی زیارت کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے اپنے طویل مراسلے میں مسلمانوں کی ہمت، جرأت ایثار اور قربانی، حکومت کے استبداد، ظلم، جور اور جبر کے بہت سے واقعات لکھے ان کے اعادہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ایک بات ضرور خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس موقع پر کشتگانِ کانپور کی امداد و اعانت کے لیے چندے کی تحریک بھی ہوئی تھی، ہمدرد کے نمائندے کا بیان ہے :-

"(۱۹ ستمبر ۱۹۱۳ء) - جب کمرے میں جگہ نہ رہی تو ہم برآمدے میں نکل آئے۔ آخر جب چاروں طرف سے ہوا بھی رک گئی اور ہمیں خطرہ اور چندے کا روپیہ لینے اور رسیدیں کاٹنے میں دقت ہونے لگی تو اس بھیڑ بھاڑ پر ایک ستم ظریف نے فقرہ چھوڑا کہ پولیس کا انتظام تو یہاں ہونا چاہیے تھا فضول، سڑکوں، مسجدوں اور عیدگاہوں پر پہرہ کیوں دے رہی ہے قصہ مختصر محلے محلے کے لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اپنی اپنی مسجدوں اور گھروں سے جمع کیا ہوا چندہ پیسے، اکنیاں، دونیاں، وغیرہ لاکر لجاجت اور انکسار کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ صاحب استطاعت لوگ، اپنے بچوں کی عیدیوں کی معقول رقمیں شہداء اور مجروحین کے بچوں کے لیے پیش کرتے تھے۔ احساسِ قومی یہاں تک تیز ہوگیا کہ شام کے وقت ایک صاحب نے مجھ سے کہا طوائفیں بھی برقعہ پوش ہوکر چندہ پیش کرنا چاہتی ہیں۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان لہو و لعب کی بندیوں اور عیش و عشرت کی دیویوں نے بھی "کشتگانِ معرکہ کانپور" کے غم میں نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا، نہ ہاتھوں میں مہندی، نہ سر میں کنگھی چوٹی کی، نہ تن پر

زرق برق کپڑے پہنے۔ بلکہ میلے کچیلے کپڑے تن ڈھانکنے کو استعمال کیے۔ اس سے قبل بھی یہ طبقہ جسے حقارت کے ساتھ دیکھنے کے بجائے ہمیں اپنے معاصی پر غور کرنا چاہیے۔ جنگ ٹرکی و بلقان میں میں فیاضی کے ساتھ چندہ دے چکا ہے۔

یہ تو عوام کی کیفیت ہوئی۔

سر رضا علی کی ایک تقریر اب ذرا خواص اور عافیت پسند حضرات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جن کی بہترین نمائندگی مسٹر (بعد میں سر) رضا علی کر رہے تھے۔ انھوں نے ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو مراد آباد کی جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے، ایک نہایت ہی متین، مدلل، شائستہ اور معرکہ آرا تقریر کی، انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"بعض احباب کا خیال ہے اس جلسے کی شرکت، گورنمنٹ کے خلاف ہے امر دریافت طلب یہ ہے کہ گورنمنٹ سے کیا مطلب ہے؟ اگر حکومت سے مراد وہ تمام اہل کار، افسر اور عمال ہیں۔ جو حکومت کے عہدوں اور مناصب پر اس لیے فائز ہیں کہ رعایا کی فلاح و بہبود میں ساعی ہوں تو ممکن ہے ایک حد تک اس جلسے پر یہ الزام درست ہو مگر پھر بھی ہم زیادہ موردِ الزام نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم حکومت کے تمام امور پر نکتہ چینی نہیں کرتے صرف انہی پر اعتراض کرتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں۔ اگر آپ یہ باور کرتے ہیں کہ مسٹر ٹیلر مجسٹریٹ۔ اور مسٹر ڈاڈ سپرنٹنڈنٹ پر بجا اعتراض کرنا حکومت کی مخالفت ہے تو میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم حکومت کے مخالف ہیں۔ لیکن یہ اصول نہایت اندیشہ ناک ہے، جیسا کہ ایک مقدمے میں کلکتہ ہائی کورٹ میں بطور مذاق کہا گیا تھا کہ پھر ایک کانسٹبل کو بھی گورنمنٹ ماننا پڑے گا۔ اور کوئی شخص اپنے آپ

کو خطرے میں مبتلا کیے بغیر کانسٹبل پر بھی اعتراض نہیں کر سکتا لیکن نہ کانسٹبل گورنمنٹ ہے نہ مسٹر ٹیلر نہ مسٹر ڈاڈ جس طرح کسی سپاہی کی نازیبا حرکت پر ہمیں اس کی شکایت کرنے کا حق ہے۔ اسی طرح مسٹر ٹیلر اور مسٹر ڈاڈ کی غلطیوں پر حکام بالادست کی خدمت میں معروضات کا ہمیں حق حاصل ہے اور ہمارا یہ حق کوئی طاقت اس وقت تک نہیں لے سکتی جب تک ہم کو برٹش گورنمنٹ کی رعایا ہونے کا حق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملے کا تعلق ہمارے صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن سے ہے اور اس طرح کے جلسوں سے ان کی مخالفت متصور ہو سکتی ہے۔ یہ خیال بھی اسی قدر غلط ہے جیسا کہ پہلا خیال، سر جیمس مسٹن کے کسی فعل پر ہم اعتراض کریں تو اس سے حکومت کی کیا مخالفت ہو سکتی ہے؟ اگر لیفٹیننٹ گورنر کے ہر فعل کو خواہ وہ زیبا ہو یا نازیبا ہم آمنّا و صدّقنا کہہ کر تسلیم کر لیں تو اس اصولِ حکمرانی کو ہمیں خیرباد کہنا پڑے گا، جو انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد ہے (یعنی جمہوریت) ہم ملک معظم کی وفادار رعایا ہیں۔ جس کی وفاداری، جاں بازی، اور جاں نثاری کی صدائیں سمالی لینڈ اور یوشہر تک گونج رہی ہیں۔ ہم نے حکومت کی طرف سے خود اپنے ہم مذہبوں سے جدال و قتال کیا، بلوچیوں کو خون میں ہم نے نہلایا۔ کابل والوں سے ہم لڑے، ایرانیوں کے مقابلے میں ہم نے تلوار نکالی۔ کیا ۱۸۹۷ء کی سرحدی لڑائی میں مسلمان فوجیں سب سے زیادہ سرفروش ثابت نہیں ہوئیں؟ خود کانپور میں جن سنگینوں اور بندوقوں نے مسلمانوں کو عالم حیات سے عالم ممات میں پہنچا دیا گیا۔ کیا ان میں بہت سی سنگینیں اور بندوقیں خود مسلمانوں کی

نہ تھیں ؟ کیا ہماری وفاداری کے کافی امتحانات نہیں ہو چکے ؟ پھر آج ہم سے کیوں کہا جاتا ہے کہ ہماری وفاداری زوال میں ہے ؟ ہماری وفاداری تخت وتاج میں ہے مگر ہم نے کوئی معاہدہ ایسا نہیں کیا ہے کہ ہم اپنی چھاتیوں کو ٹیلر کی سنگینوں اور تلواروں کا نشانہ بنا دیں۔!"

کیفی چڑیاکوٹی کا ایک قطعہ

سر رضا علی ایک بہترین قانون داں تھے۔ انھوں نے قانونی باریکیوں کو پیش نظر رکھ کر دہشت اور خوف وہراس کے زمانے میں جو تقریر کی اس سے بہتر تقریر اس وقت کرنا ممکن ہی نہ تھی۔

اس موقع پر مشہور عالم اور شاعر حضرت کیفی چڑیاکوٹی نے ایک بڑا پر لطف قطعہ کہا تھا، وہ بھی سن لیجیے ؎

ابن مریم کو دور کی سوجھی — اور موسیٰ کو طور کی سوجھی
ملی فرصت جو حشر والوں کو — فتنۂ کانپور کی سوجھی

آزاد انصاری کا ایک قطعہ

مشہور شاعر، حکیم آزاد انصاری بھی، جو اس زمانے میں نوجوان تھے، خاموش نہ رہ سکے اور اپنے جذبات، اور واردات ایک قطعے کی صورت میں بیان کر گئے :-

رعایا حکومت سے ناخوش نہ ہو — اسی میں ہے مضمر حکومت کی زیست
مگر لاٹ صاحب کو پرواہ نہیں — بریں ملک داری بباید گریست

محاذ بنانے کی کوشش

یہ عوامی جوش اور عافیت پسندوں کی طلاقت لسانی حکومت کے لیے بہر حال خوش آئند نہ تھی، حکومت کی طرف سے جو بھی ہو رہا تھا جبر و استبداد کی صورت میں تو ظاہر ہی تھا پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ ان سر پھرے باغی اور جنگجو مسلمانوں کے خلاف وفادار سرکار مسلمانو

کا ایک محاذ قائم کرے جو اس زہر کا تریاق ثابت ہوسکیں۔
نگاہ انتخاب نواب صاحب رام پور پر پڑی۔

حکومت کی حمایت میں ایک جلسہ

نواب صاحب ان والیانِ ریاست میں تھے جو بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کے وفادار تھے! یا اگر شاعرانہ زبان میں کہیئے تو پھر میر کا یہ شعر مستعار لینا پڑے گا ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو اب ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور فہم و فراست اور دور اندیشی کے اعتبار سے معمولی شخص نہیں بلکہ غیر معمولی شخص تھے۔ وہ حق وفا ادا کرنے پر فوراً تیار ہو گئے۔ انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ قوم ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔ خدا کو کیا جواب دیں گے؟۔ اپنے اسلام کو اپنی اس طابع آزمائی سے کس طرح ہم آہنگ کرسکیں گے؟ انھیں صرف یہ فکر تھی کہ ملک معظم کے وفاداران ازلی کی فہرست سے ان کا نام نامی نہ صرف یہ کہ خارج نہ ہو بلکہ سرخ روئی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔ وہ سر جیمس مسٹن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھے۔ ہر خطرہ مول لے سکتے تھے۔ انھوں نے اطراف واکناف ہند سے اپنے جیسے وفاداروں کو طلب کیا۔ اور مسلمانان ہند کا ایک جلسۂ عام دہلی میں اپنی زیر صدارت منعقد کیا۔ وہ ایک والی ریاست تھے ان کے پاس نہ دولت کی کمی تھی نہ کرائے کے آدمیوں کی۔ نہ مفاد پرستوں اور طابع آزماؤں کی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کی مشینری ان کی پشت پناہی اور امداد و اطاعت کو موجود تھی۔ وہ بالکل مطمئن تھے کہ جلسہ کامیاب ہوگا اور وہ مسند وفاداری حاصل کرلیں گے۔ انھوں نے ایک ہوشیاری یہ بھی کی تھی کہ اس تحریک کے روح رواں

قافلۂ سالار، راجہ صاحب محمود آباد کو شرکت کی دعوت نہیں دی تھی۔ مسلمانوں کے مسلمہ رہنما نواب مشتاق حسین وقار الملک کو دعوت نامہ نہیں بھیجا اور دوسرے نوجوان اور جوشیلے رہنماؤں کو بھی اذنِ حاضری نہیں دیا۔ صرف اپنے ہم خیالوں کو مدعو کر کے کامیابی کا یقین کر لیا۔

لیکن جلسہ بری طرح ناکام ہوا، ہنگامہ آرائی ہوئی نہ کوئی تجویز منظور ہو سکی نہ قرارداد افراتفری کے عالم میں جلسہ برخاست ہوا۔ نواب صاحب رام پور کو شکست فاش تسلیم کرتے ہوئے دوسرا جلسہ طلب کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔

یہ دلچسپ تفصیل آئندہ باب میں پیش کی جائے گی۔

اس باب میں وزیر حسن، رضا علی، اور نواب صاحب رام پور کا ذکر آیا ہے ان کا مختصر تعارف مناسب ہو گا۔

وزیر حسن وزیر حسن لکھنؤ کے کامیاب وکیل تھے، بے حد ذکی، فہیم اور قابل۔ عرصے تک مسلم لیگ کے سکریٹری بھی رہے پھر راجہ صاحب محمود آباد کے اثر سے چیف کورٹ کے چیف جج ہو گئے۔ چیف جج ہونے کے بعد کانگریس میں شرکت کر لی۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں مرکزی اسمبلی کی نشست کے لیے کھڑے ہوئے اور بری طرح شکست کھائی۔ ہندوستان کے ایک وزیر علی ظہیر ان کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے دوسرے صاحبزادے سجاد ظہیر ہیں جو پاکستان کے مقدمۂ سازش میں سزایاب ہوئے پھر ضمانت پر رہا ہو کر بھارت فرار ہو گئے۔ اب وہ ہندوستان میں ہیں۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

سر رضا علی رضا علی بھی اپنے زمانے کے بہترین وکیل تھے۔ سر کے خطاب سے نوازے گئے۔ جنوبی افریقہ میں بھارت کے ہائی کمشنر بن کر گئے،

وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا مذہبی اور ملی درد رکھتے تھے۔ ایسے موقع پر حکومت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ نکتہ سنج بھی بڑے پائے کے تھے۔ ادیب اور انشا نواز بھی تھے۔ ان کی خود نوشت "اعمال نامہ" اردو لٹریچر کا گراں بہا سرمایہ ہے۔ ابو طالب نقوی مرحوم چیف کمشنر کراچی ان کے داماد تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ پاکستان آ گئے اور یہیں انتقال فرمایا۔

نواب رام پور نواب صاحب رام پور کا نام سر حامد علی خاں تھا۔ انگریز کے بے حد معتبر اور خوں آشام تھے۔ علی برادران کو جو ایذائیں انھوں نے پہنچائیں وہ تاریخ شقاوت کا ناقابل فراموش باب ہیں۔ انگریز پرستی کے اعتبار سے اپنے طبقے میں مشہور تھے۔ مولانا عبد الحلیم شرر نے "اسرار دربار رام پور" میں انھیں کا مرقع کھینچا ہے۔ ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

حادثۂ کانپور اور عافیت پسند

(۲)

نواب رامپور ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور بہت بڑے والئی ریاست نہ تھے لیکن سرکاری طور پر ان کا مرتبہ اور مقام بہت اونچا تھا، وائسرائے ان کا خاص طور پر لحاظ رکھتا تھا۔ نظام دکن اگر سرکار برطانیہ کے "یار وفادار" تھے تو ہز ہائی نس سر حامد علی خاں حکومت انگلشیہ کے "فرزند دلبند" تھے، دوسرے والیان ریاست کی لغزشوں اور خطاؤں پر حکومت کی طرف سے "تحقیقاتی کمیشن یا تاج و تخت سے دست برداری" کا الٹی میٹم مل جاتا تھا۔ لیکن نواب صاحب رام پور ہر باز پرس سے آزاد تھے۔ یوپی میں وہ واحد والئی ریاست تھے جنھیں اندرون ریاست مکمل حقوق شہریاری غیر مسئول طور پر حاصل تھے، اس لیے مسلمان بھی ان کا مان رکھتے تھے اور ان کے ٹھاٹھ باٹ اور اختیار و اقتدار کو گونہ فخر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نواب صاحب ان حالات سے باخبر تھے۔ اسی لیے انھیں یہ جرأت ہوئی کہ اپنی سربراہی میں، اپنے چند ہم نواؤں کو مجتمع کر کے عامۃ المسلمین کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت برطانیہ کے ساتھ اظہار وفاداری کریں اور اسے یقین دلائیں کہ حادثۂ انہدام مسجد کانپور کے سلسلے میں یہ جو شور و شر ہو رہا ہے

یہ صرف چند سر پھرے لوگوں کی حرکت ہے۔ ورنہ مسلمان قومی طور پر جادۂ وفا سے نہ منحرف ہوئے ہیں، نہ ایسی جرأت ناروا کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ نواب صاحب کو اپنی ذات پر، اپنی شخصیت پر، اپنے اثر و رسوخ پر اپنی اہمیت اور وجاہت پر، اپنے وسائل و ذرائع پر کامل اعتماد تھا لیکن دل میں چور بھی تھا۔ مسلمانوں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر کچھ سراسیمہ بھی تھے۔ اگرچہ جلسۂ عام منعقد فرمایا، لیکن درحقیقت اس میں عوام شرکت کے مجاز نہ تھے۔ صرف صلائے عام تھی یاران نکتہ داں کے لیے" سو یارانِ نکتہ دان ہر گوشے سے بے شک بہ تعداد کثیر رونق افروز ہوئے تھے اور اس صورت میں یقین تھا کہ جو چاہیں گے منظور کرائیں گے اور جو چاہیں گے کہہ سکیں گے۔

پراسرار جلسے کی روداد

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ہمدرد میں آنریبل سید رضا علی نے جو سر علی محمد خاں راجہ محمود آباد کی اقتدا میں ہر ذاتی مفاد سے بے پروا اور بے نیاز ہو کر کھل کے میدان میں آ چکے تھے، اس پراسرار جلسے کی کہانی، اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں بیان فرمائی ہے۔ جس کے جستہ جستہ حصے اگر پیش نظر رہیں تو پورا مرقع نظر کے سامنے آجائے گا۔ موصوف نے اپنے مضمون میں فرمایا:

"مسٹر اظہر علی بہ حیثیت سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور یہ خاکسار بہ حیثیت قائم مقام مسلمانان روہیلکھنڈ کے یکم اکتوبر کے جلسۂ منعقدہ دہلی میں ناخواندہ مہمان کی طرح شریک ہوئے، ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور نے ایک مختصر تحریری اسپیچ میں مسلم پریس کو اعتدال پر رہنے کا مشورہ دیا۔ اور فرمایا اگر (مسلمانوں کو) گورنمنٹ سے مصالحت کرنے کی خواہش ہے تو میری خدمات قوم کے واسطے حاضر ہیں!"

ظاہر ہے نواب صاحب کی وساطت سے، جنھوں نے اس قیامت خیز سانحے میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا، کوئی خوشگوار امید نہیں قائم کی جاسکتی تھی۔ محمد علی اور وزیر حسن اب تک لندن میں تھے اور ان کی طرف سے جو تار آرہے تھے، وہ اُمید افزا نہ تھے۔ انھیں یقین تھا حکومت برطانیہ مداخلت کرکے اس معاملے کو حسبِ دلخواہ طے کردے گی۔ پراسرار جلسہ دہلی کی ایک غایت یہ بھی تھی کہ لندن سے کوئی فیصلہ نافذ ہونے سے قبل سر جیمس مسٹن کی عزت "سمجھوتہ" کرکے رکھ لی جائے چنانچہ آنریبل مسٹر (بعد میں سر) محمد شفیع بیرسٹرایٹ لا نے اپنی تقریر میں موجودہ حالات پر بحث کرتے ہوئے چند مسلمان رہنماؤں کی عدم موجودگی پر خصوصی توجہ دلائی اس کے بعد سر رضا علی نے تقریر کی۔ وہ فرماتے ہیں:-

"ازاں بعد خاکسار نے قوم کے نقطۂ خیال کو جلسے کے سامنے پیش کیا، اور عرض کیا کہ چونکہ قوم کے دو مسلّمہ اور واجب التعظیم لیڈر یعنی عالی جناب نواب مشتاق حسین (وقار الملک) اور آنریبل راجہ صاحب محمود آباد نہ مدعو کیے گئے ہیں نہ جلسے میں تشریف رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ جلسہ جائز طور پر اس کا مدعی نہیں ہوسکتا کہ اپنے کو مسلمانوں کا قائم مقام نمائندہ قرار دے۔ اگر آپ حضرات کی یہ خواہش ہے کہ قوم تفرقے کی مصیبت سے بچ جائے تو اس جلسے کو ہرگز کسی ایسے مسئلے پر بحث نہیں کرنی چاہیئے جس کا اثر مسلمانوں کی پالیسی پر پڑتا ہو، بلکہ اس غرض کے لیئے ایک عام جلسہ کسی مناسب مقام پر منعقد کیا جائے۔

اس کے بعد خان بہادر مسٹر آل نبی رئیس آگرہ نے ایک نہایت مدلّل تقریر میری تائید میں فرمائی۔ بعد ازاں مسٹر حامد علی بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ نے فرمایا کہ اگرچہ دو لیڈران قوم شریک جلسہ نہیں ہیں مگر ان کی عدم شرکت سے

کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ موصوف نے دوران تقریر ایک ایسا جملہ بھی فرمایا جس سے جلسے میں برہمی پیدا ہوگئی۔ مسٹر اظہر علی اور مسٹر محمد یعقوب وکیل مراد آباد نے پرزور اور پُرجوش تقریروں میں فرمایا کہ اس جلسے کا کسی امر کو طے کرنا نہایت غیر مآل اندیشانہ اور نامناسب کارروائی ہوگی، یہ جلسہ ہرگز قوم کا قائم مقام جلسہ نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ اس کے انعقاد میں جو ریشہ دوانیاں کی گئی ہیں وہ نواب وقار الملک اور آنریبل راجہ صاحب محمود آباد کے مدعو نہ کرنے سے ظاہر ہیں!"

ان تقریروں نے جلسہ کا رنگ بدل دیا اور نواب صاحب رام پور کو اپنی شخصیت اور اپنے اثر و رسوخ سے متعلق جو غیر معمولی حسن ظن تھا دور ہوگیا۔ نواب سربلند جنگ حمید اللہ خاں نے بھی نواب صاحب کے مدح و ثناء کا اپنی تقریر میں حق ادا کر دیا۔ لیکن جس جلسے میں خود نواب صاحب رام پور کی نہ سنی گئی اور مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کو بیٹھ جانے اور معذرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بھلا وہاں سربلند جنگ کی تقریر کیا اثر کر سکتی تھی، یا جس جلسے پر نواب صاحب ان کے رفقا اور حامی اس درجہ مطمئن تھے، وہ دیکھتے دیکھتے مخالفانہ اجتماع بن گیا۔ عوام کے جذبات سے کھیلنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ ان کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں اور جب وہ کسی بات پر اڑ جاتے ہیں اور کسی فیصلے تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر نہ امارت کی وجاہت ان پر اثر ڈال سکتی ہے، نہ قوت و طاقت کی نمائش سے وہ مرعوب ہو سکتے ہیں، بالکل یہی کیفیت اس جلسے کی ہوئی۔ اتنی احتیاطوں پیش بندیوں، اور ریشہ دوانیوں کے بعد جو جلسہ حکومت ہند کی راج دھانی میں بڑی امیدوں اور توقعات کے ساتھ منعقد کیا گیا تھا وہ حد درجہ افراتفری کے عالم میں برخاست ہونے لگا۔ عوام کے جذبات سے کھیلنا دل لگی نہیں ہے۔

ع یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

آخر جب اس میخانے میں پگڑی اُچھل چکی تو آنریبل محمد شفیع کو نواب صاحب رامپور کی بے بسی پر ترس آیا، آدمی معاملہ فہم اور دور اندیش تھے۔ انھوں نے بظاہر اس جلسے کو اس طرح ملتوی کرایا اور التوا کے ساتھ ایسی شرائط منظور کرائیں کہ پھر اس طرح کا جلسہ کرنے کی نواب صاحب رام پور اور ان کے ہمنواؤں کو جرأت نہ ہو سکی۔

آنریبل محمد شفیع نے آخر میں ایک رزولیوشن پیش کیا جس میں ہز ہائی نس کی افتتاحی تقریر کا شکریہ ادا کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ ان معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک نمائندہ جلسۂ عام جلد منعقد کیا جائے۔

یہ تجویز جو اس حقیقت کی مظہر تھی کہ یہ جلسہ نمائندہ نہیں ہے بالاتفاق منظور ہو گئی۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ مسلمانانِ ہند کا نمائندہ اجتماع کون طلب کرے۔ یا اس موقع پر منشی عبدالعزیز صاحب مینجر پیسہ اخبار لاہور اور مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر اخبار "وطن" نے آنریبل محمد شفیع کی تجویز پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اور طے شدہ تصفیہ کی مخالفت کر کے پھر ہنگامہ آرائی پیدا کر دی۔ لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ نواب صاحب رام پور کی اشک شوئی کے لیے جہاں یہ طے پایا کہ دوسرا نمائندہ جلسہ نواب صاحب موصوف ہی طلب کریں۔ وہاں یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ راجہ صاحب محمود آباد سے صلاح مشورے کے بغیر نواب صاحب رام پور کوئی اقدام نہیں کریں گے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ نواب صاحب کو اس بات کا وعدہ بھی کر لینا پڑا کہ وہ راجہ صاحب محمود آباد سے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے۔

بھڑکتی ہوئی آگ پر نواب صاحب رام پور برف ڈالنے تشریف لائے تھے، اور غالباً اپنی طرف سے نہیں بلکہ ملاء اعلیٰ کے اشارے پر۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے!

بہر حال اس گریباں چاکی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر کوئی دوسرا جلسہ نہیں طلب کیا گیا اور حکومتِ ہند مجبور ہوگئی کہ اپنے چہیتے لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن کو عارضی طور پر چھٹی پر بھیج دے اور وائسرائے صاحب بنفس نفیس اس مسئلے کا تصفیہ کریں یہ پہلی عوامی فتح تھی جو مسلمانوں نے غدر کے بعد حکومت پر حاصل کی جس کی ضروری تفصیل آئندہ باب میں پیش کی جائے گی تاکہ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کے پہلے کامیاب جہاد کی تاریخ محفوظ ہو جائے۔

اس باب میں جن شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا مختصر سا تعارف ضروری ہے۔

اظہر علی مسٹر اظہر علی، کاکوری کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے نہایت شریف اور دین دار آدمی تھے۔ قائد اعظم نے جب مسلم لیگ کا احیاء کیا تو یہ اس میں گوشۂ عزلت چھوڑ کر پھر شریک ہو گئے۔ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بعد جب پہلی مرتبہ مجالس آئین ساز کا انتخاب ہوا تو یہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے اور اپنے بہت بڑے اور طاقتور حریف کی اس حالت میں کہ کانگریس اس کی پشت پناہ تھی، زبردست شکست دی ان کے صاحب زادے آئی سی ایس کے امتحان میں کامیاب ہوئے، اب پاکستان میں ہیں۔

سر محمد شفیع آنریبل مسٹر محمد شفیع ۔ جو بعد میں سر کے خطاب سے سرفراز ہوئے وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل کے دو مرتبہ ممبر بنے، بیگم شاہ نواز ان کی صاحبزادی ہیں، یہ خاندان ہمیشہ سے سیاست میں حصہ لیتا رہا ہے، میاں محمد شفیع کی دوسری بیٹی گیتی آرا، میاں بشیر احمد سابق سفیر ترکیہ کی اہلیہ ہیں، جن کے صاحبزادے مسٹر منظر بشیر بھی سیاست میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔

آل نبی مسٹر آل نبی، آگرہ کے رئیس اور وکیل تھے، ہمیشہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے نہایت شریف اور پاک نہاد شخص تھے، تقسیم ہند سے بہت پہلے وفات پا گئے۔

سر محمد یعقوب سر محمد یعقوب - انھیں بھی بعد میں سر کا خطاب ملا۔ بڑے اچھے مقرر تھے اور مسلمانوں کے معاملات میں جوش اور خلوص سے حصّہ لیتے رہتے تھے۔ علی گڑھ میں مولانا محمد علی کے ہم درس تھے عرصۂ دراز تک مرکزی اسمبلی کے ممبر اور ڈپٹی پریسیڈنٹ رہے۔ ایک مرتبہ وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے عارضی طور پر کچھ مدت کے لیے ممبر بھی رہے۔ بعد میں ریاست حیدر آباد میں "مشیر اصلاحات سیاسی" کے منصب بلند پر فائز ہو کر تشریف لے گئے۔ وہیں قلب کے مرض میں وفات پائی۔

منشی عبدالعزیز منشی عبدالعزیز۔ یہ "پیسہ اخبار لاہور" کے منیجر اور منشی محبوب عالم ایڈیٹر و مالک "پیسہ اخبار" کے بھائی تھے۔ اپنے زمانے میں "پیسہ اخبار" ملک کا نہایت وقیع اور مالی اعتبار سے حد درجہ کامیاب اخبار تھا۔

مولوی انشاء اللہ خاں مولوی انشاء اللہ خاں - یہ اخبار وطن کے ایڈیٹر تھے۔ وطن اور پیسہ اخبار، دونوں حریف تھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روز نامہ وطن معنوی اور ادبی حیثیت سے اپنے حریف و مقابل روز نامہ "پیسہ اخبار" سے زیادہ موقر تھا۔ مولوی انشاء اللہ خاں کو علمی ذوق تھا۔ انھوں نے کئی مفید کتابیں لکھیں ترکوں سے خلیفۃ المسلمین سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ چنانچہ ترکیہ سے متعلق بھی انھوں نے کئی قابل قدر کتابیں تحریر کیں جو بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ خاں صاحب نے کئی کتابوں کا کامیاب ترجمہ بھی کیا۔ لاہور میں "وطن بلڈنگ" اب بھی موجود ہے "وطن ہائی اسکول" بھی جاری ہے۔ ان کے صاحب زادے ظفر اللہ خاں صاحب بھی قومی اور ملکی امور میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اور اپنے رنگ میں جیسی کچھ خدمت بن پڑتی

ہے کرتے رہتے ہیں ۔

منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر "پیسہ اخبار" کے صاحبزادگان بھی بفضل خدا زندہ سلامت ہیں ۔ لیکن سیاست اور صحافت سے اخص کوئی تعلق نہیں ہے ۔ خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس پر مطمئن ہیں ۔

حادثہ کانپور — مصالحت

حاکم اور محکوم کی کوئی جنگ بھی پہلی مرتبہ فیصلہ کن نہیں ثابت ہوتی اور یہ تو کبھی نہیں ہوتا کہ حاکم اور محکوم کے مابین اس طرح لڑائی ہو کہ ایک طرف مسلح فوج اور پولیس ہو اور دوسری طرف نہتّا مجمع۔ ایک جانب توپیں اور بندوقیں، سنگینیں اور تلواریں ہوں اور دوسری جانب کھلے ہوئے سینے اور پھر یہ لڑائی حاکم کی شکست اور محکوم کی فتح کی صورت میں ختم ہوئی ہو۔

حکومت کی ناکامی کانپور میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور حکومت کے مقابلے میں نہتے مسلمان اینٹ اور پتھر لے کر مقابلے کو نکلے تھے، گولیاں چلیں، بوڑھے، جوان بچے زخمی ہو ہو کر گرے۔ خاک و خون میں تڑپے، اور جامۂ خوں چکاں زیب تن کر کے اپنے رب سے جا ملے جو مرنے سے بچ رہے وہ جیل پہنچا دئے گئے اور ان کے خلاف ایسے سنگین الزامات عدالت کے روبرو عاید کئے گئے۔ جن کی سزا پھانسی یا حبس دوام بہ عبور دریائے شور ہی ہو سکتی تھی، ان شہیدوں اور زخمیوں کے گھر کا حال یہ تھا کہ دنِ روزِ قیامت سے کم نہ تھا اور رات شب بلا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نہ

گھر میں کھانے کو نہ ضروریات زندگی کی تکمیل کا کوئی سہارا تھا۔ جس گھر میں بیوی اپنے سہاگ پر نازاں تھی اب وہ بیوہ ہو چکی تھی ۔ دنیا اس کی نظر میں تاریک تھی، جس گھر میں ہنستے کھیلتے بچّے رونق اور چہل پہل کا سبب بنے ہوئے تھے وہ اب یتیم تھے اور کوئی ان کی بات پوچھنے والا نہ تھا۔ یہ واقعات اور حادثات ایک سہمی ہوئی قوم کو دہشت زدہ اور مرعوب کر دینے کے لیے کافی تھے لیکن خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔ ساری قوم میں بیداری کی لہر پیدا ہو گئی۔ پوری قوم دیوار آہن بن کر کھڑی ہو گئی۔ عافیت پسندوں نے کفن سر سے باندھا اور میدان میں اُتر آئے ۔ جاں نثاروں نے سر دھڑ کی بازی لگائی اور مرنے کو تیار ہو گئے ۔ آخری چارۂ کار کے طور پر حکومت نے اپنے مخصوص وفاداروں کو فتنہ انگیزی ، تفرقہ اندازی اور باہمی کشمکش پیدا کرنے کے لیے میدان میں اتارا ۔ یہ مفاد پرست، طالع آزما اور خود غرض لوگ "خدمات" انجام دینے کو اسٹیج اور پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہوئے ۔ لیکن منہ کی کھائی ۔ ذلیل ہوئے ، روپوش فرار لائے ۔ اب اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ ہز ہائی نس نواب رام پور اور نواب سر بلند جنگ جیسے غاشیہ بردارانِ سلطنت کے بھی پاؤں نہ جم سکے اور رائے عامہ کا طوفانِ بلاخیز انھیں تنکے کی طرح بہالے گیا ۔

کانپور میں وائسرائے کی آمد

ان حالات کو دیکھ کر حکومت کو اپنے جابرانہ طرز عمل پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی ، لندن میں محمد علی اور وزیر حسن کی مساعی بھی اس کی محرک ہوئیں ۔

آخر ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ہز اکسی لینسی وائسرائے بہادر شملہ کی بلندی سے اتر کر کانپور کی پستی پر جلوہ فرما ہوئے ہمدرد نے کتنا لطیف طنز کیا تھا ۔

وہ آئے ہیں ہماری نعش پر آج
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے !

وائسرائے کی تقریر اور مسئلے کا حل

وائسرائے نے ایک درمیانی راستہ مسلمان اہل الرائے سے صلاح و مشورے کے بعد نکالا جس پر مسلمانوں نے اتفاق کر لیا۔ انھوں نے ایڈریس کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ترقی اور تہذیب کی رفتار کے ساتھ یہ ہمیشہ ممکن ہے۔ کہ سڑکوں، ریلوں اور نہروں کی تعمیر موجودہ مذہبی عمارتوں کے ساتھ ٹکرائے، لیکن آپ لوگوں کو یقین رکھنا چاہیئے کہ حکومت پوری توجہ سے ان لوگوں کے مطالبات پر غور کرے گی جن کے مفاد پر اس طرح اثر پڑنے کا اندیشہ ہوگا اور ہمیشہ کوشش کرے گی کہ مسئلہ متنازعہ کو اس طرح حل کرے جو تمام متعلقہ اشخاص کے لیئے قابلِ قبول ہو۔ میں شملہ سے آپ کے لیے پیام امن لے کر آیا ہوں، میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ آٹھ فٹ بلند ایک چھتہ بنا دیا جائے اور اس پر دالان اسی طرح اور اسی مقام پر تعمیر کر دیا جائے، جیسا کہ پہلے سے موجود تھا، مگر پہلے سے ذرا بلندی پر تاکہ نیچے اس طرح ایک سڑک نکل آئے جس سے مسجد کی متعلقہ عمارت میں کسی قسم کی مداخلت اور فتور نہ ہو۔"

یہ فرمانے کے بعد ہز اکسی لینسی وائسرائے نے مزید اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں آپ کے باپ کی جگہ پر ہوں۔ آپ سب میرے بچے ہیں۔ جب بچے غلطی کریں تو یہ ان کے سرپرست کا فرض ہے کہ باوجود بھی محبت کے انھیں تنبیہہ کرے تاکہ انھیں عقل آئے اور وہ دوبارہ پہلی سی غلطی نہ کریں!"

اس کے بعد فرمایا:۔

"گورنمنٹ کا یہ فرض تھا کہ ماخوذین پر مقدمہ چلائے اور انھیں سزا دے

مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے میں کانپور امن کا پیغام لے کر آیا ہوں، میں ان لوگوں سے بھی درگزر کرتا ہوں جنھوں نے بلوے کی اشتعالک دی، میری خواہش ہے کہ جن لوگوں پر بلوے میں شامل ہونے کا الزام لگایا گیا ہے ان کی تکلیفات ختم کر دی جائیں اس لیے میں نے لوکل گورنمنٹ سے کہا ہے کہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کے مطابق ان لوگوں کے ساتھ کارروائی کی جائے جن کا بلوے کے ساتھ تعلق تھا اور جو سشن سپرد کر دیئے گئے تھے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ مسئلہ مسجد کا میں نے جو حل کیا ہے، اور ماخوذین سے متعلق جو اعلان کیا ہے اس سے نہ صرف کانپور کے مسلمان مطمئن ہو جائیں گے بلکہ ہندوستان کی تمام مسلم آبادی بھی مطمئن ہو جائے گی!"

قیدیوں کی رہائی اور مقدمات کی واپسی

وائسرے کے اس اعلان کے بعد

"ایک بہت بڑا مجمع عدالت سشن میں ملزمین کی رہائی کی امید میں منتظر کھڑا تھا۔ مسٹر ٹائل سشن جج جو اس مقدمے کی سماعت کرنے کے لیے خاص طور پر بلائے گئے تھے عدالت میں موجود تھے۔ مسٹر لوائر وکیل سرکار نے کہا کہ حکومت کی ہدایت کے مطابق تمام ملزمین کے خلاف مقدمہ واپس لینے کی درخواست کرتا ہوں، جو تین مختلف دفعات کے تحت سشن سپرد کیے گئے ہیں، مسٹر مظہر الحق نے کہا وہ بخوشی اسے قبول کرتے ہیں فوراً ہی قیدی رہا کر دیے گئے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر جو پہلے سے اس غرض کے لیے مہیا کی گئی تھیں اپنے اپنے گھروں میں پہنچا دیئے گئے۔ خلقت کا اژدہام اس قدر تھا کہ پولیس کو مجمع کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ دشواری پیش آئی!"

مولانا عبدالباری کا بیان:۔ یہ مسئلہ سیاسی نہ تھا خالص مذہبی مسئلہ تھا، اور ان

حضرات کی تائید و توثیق کے بغیر مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔ جو عالم دین کی حیثیت سے بلند مرتبے کے حامل تھے ؛ مذہبی حیثیت سے اس مسئلے کی سربراہی، قیام الملّت والدّین حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے دست مبارک میں تھی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں حضرت کا ایک طویل بیان اس سلسلے میں شائع ہوا۔ جس کے خاص خاص حصّے یہ ہیں۔

"مجھ سے ان حضرات نے جن پر مجھے پورا بھروسہ ہے مثلاً مسٹر مظہرالحق اور راجہ صاحب محمود آباد نے دریافت کیا کہ آیا مصالحت مناسب ہے یا نہیں ؟ میں نے کہا اگر احترام اسلام کے ساتھ مصالحت ہو تو بے حد غنیمت ہے، میرا تعلق خاص شرعی مسئلے سے تھا۔ میں نے اس بات کا وعدہ کر لیا کہ تا بہ امکان ایسی شرعی صورت نکالوں گا جس سے اس مخمصے سے نجات ملے مسلمانوں کی عزّت باقی رہے اور گورنمنٹ کا وقار بھی قائم رہے۔ مگر مسجد کے معائنے کے بعد اور علماء سے مشورہ لے کر میں ایسا کر سکتا تھا، چنانچہ میں کانپور گیا، مسجد دیکھی واقعات سُنے، اور اس امر کو تسلیم کر لینا پڑا کہ جزو متنازعہ جزو مسجد ہے، میں نے اہل علم سے اس مسئلے میں مذاکرہ کیا میں نے واحد حل یہ سوچا کہ جزو متنازعہ کے درمیان مسجد کا دروازہ کر دیا جائے اور اس حصّۂ زمین کو سڑک سے مرتفع کر کے بنا دیا جائے، سہ درہ قائم ہو یا بازوؤں کے رُخ دروازے ہوں اس کی چھت کے برابر صحن مسجد کر دیا جائے۔ اس کے نیچے مسجد کا منبر ہو۔ ہمارے احباب کو یہ صورت پسند آئی۔ اس شرط پر کہ یہ نظیر آئندہ کے لیے نہ ہو۔ حضور وائسرائے نے تمام معاملات کے تصفیے کے لیے بالآخر لیفٹنٹ گورنر نے نواب سر علی امام ممبر وائسرائے کونسل کو کانپور بھیجا، مابہ النزاع امور معرض بحث میں آئے اس گفتگو میں تمام وقت صرف ہو گیا،

مصالحت کی امید منقطع ہوگئی پھر میں نے یہ صورت پیش کی کہ سردست وائسرائے ہم کو دالان کی چھت پر قبضہ دے دیں اور زمین بھی دے دیں کہ ہم بنالیں، پھر ہمارا اور میونسپلٹی کا معاملہ ہو جائے گا۔ اس کو تمام قانونی حضرات نے پسند کیا۔ کل حضور وائسرائے تشریف لائے۔ حسب تجویز مجھ سے ہار پہنانے کی خدمت لی گئی۔ حضور وائسرائے نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا یہ مسجد نہایت عالی شان اور مستحکم بنائی جائے۔ شاہی عطیہ بھی اس کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا جو بے اس واقعے سے مسلمانوں کی ہوئی تھی اس کی تلافی کے کچھ امکانات جناب کی اس مخصوص سرفرازی سے ہو گئے ہیں۔ یہ پہلا واقعہ ہے کہ جب مجرمین کو رہائی دلانے کے لیے خود حاکم وقت اور نائب شاہ نے تکلیف گوارا کی، ہمیں نہایت معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ معاملہ، جزو مسجد میں حضور وائسرائے نے ہمارے صوبے کے افسر اعلیٰ مسٹر جان سیلی کو تاکیدی حکم دیا کہ احکام اسلامیہ کے احترام کو ہر حالت میں مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ میں ان وکلاء اور قانون پیشہ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنے مالی نقصان کی پروا نہ کر کے کامل ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مثلاً مسٹر ناظر الدین، مسٹر محمد اسلم، مسٹر محمد نسیم، مسٹر راس مسعود، مسٹر رضا علی، مسٹر ظہور احمد، خواجہ عبد المجید، مسٹر سید محمود، مخصوص شکریہ تین حضرات کا ادا کرتا ہوں، سب سے پہلے مستقل مزاج اور خطرات سے نہ ڈرنے والے فدائے قوم سید فضل الرحمٰن وکیل کانپور، پھر مسٹر مظہر الحق جنھوں نے گھر بار چھوڑ کر کانپور کو اپنا مسکن بنالیا، ان سب کے بعد خاص طور پر اپنے محترم عزیز، سر راجہ علی محمد خاں والیٔ ریاست محمود آباد کا شکریہ

شکریہ ادا کرتا ہوں، یہ مستغنی عن الالقاب اس طرح اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے خطرات کے مقابل ہو گئے۔ ان کی عزت اگر دلوں میں نہ ہو تو میں سمجھوں گا ایسے دلوں میں زندگی نہیں ہے، آخر میں وہ امر جو اول میں کہنے کا تھا، اب ذکر کرتا ہوں، وہ اسلامی اخبارات کی خدمات ہیں، بالخصوص زمیندار، الہلال، ہمدرد، توحید!"

حکومت اور مسلمانوں میں مصالحت

۱۰ اکتوبر کے روزنامہ ہمدرد میں اس تصفیے پر جو اداریہ لکھا گیا اس کا ایک حصہ یہ ہے :-

"وائسرائے نے واقعۂ کانپور کو حاکم و محکوم کا مسئلہ نہیں بنایا، بلکہ اسے خانگی رنجش سے تشبیہ دی، جو فیصلہ ہز اکسی لینسی نے صادر فرمایا ہے، وہ پیام امن کے نام سے معنون ہے، اور جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے، وہ بہت دیر تک اور احتیاط کے ساتھ غور و خوض کرنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں، ہم بھی اسے تدبر، دور اندیشی اور باہمی مصالحت کا بہترین حل سمجھتے ہیں۔"

ان تمام تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حکومت سے ٹکر لی اور بڑی حد تک کامیاب رہے اس موقع پر جو بیداری اور جرأت مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھی وہ قائم رہی اور وہی آگے چل کر مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب بنی۔

چند شخصیات

اس باب میں چند ایسے نام آئے ہیں جو موجودہ زمانے میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ مختصر ان کا تعارف بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔

وائسرائے وائسرائے سے مراد اس وقت کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ ہیں

سر علی امام سر علی امام۔ بہار کے رہنے والے تھے۔ اپنے زمانے کے بے انتہا قابل اور

کامیاب قانون داں تھے۔ پانچ سال تک وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل کے ممبر رہے۔ پھر ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم ہوگئے۔ وہاں، نواب موید الملک خطاب پایا، ان کے چھوٹے بھائی حسن امام بھی اسی پائے کے قانون داں تھے، کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے والد نواب امداد علی اثر بھی غیر معمولی ذہن و دماغ کے مالک تھے، عربی، اردو، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، یونانی کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ بہترین سخن گو اور سخن سنج تھے۔ نثر بھی بڑی اچھی لکھتے تھے "کاشف الحقائق" کے نام سے انھوں نے جو کتاب لکھی ہے، وہ کتبِ حوالہ میں شمار ہوتی ہے۔ شکاری بھی مانے ہوئے تھے۔

جان بیلی وائسرائے نے جب مسلمانوں کے حسب منشا مسئلہ کانپور کا فیصلہ کرنا چاہا تو سر جیمس مسٹن رخصت پر بھیج دیے گئے اور مسٹر جان بیلی قائم مقام لیفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے۔ بیلی صاحب میں وہ نخوت اور رعونت نہ تھی جو مسٹن میں تھی۔ ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے، اور اسلام سے کسی قدر متاثر بھی تھے۔ اس لیے مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردانہ تھا۔

ناظر الدین حسن ناظر الدین حسن۔ لکھنؤ کے کامیاب بیرسٹر تھے، پھر حیدرآباد دکن ہائی کورٹ کے جج، اور بعد میں میر عدالت (چیف جسٹس) ہوگئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہیں مقیم رہے۔ مسلمانوں کی علمی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں میں سیاست سے کنارہ کش ہوکر سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ابھی حال ہی میں وفات پا چکے ہیں۔

مسٹر وسیم یہ لکھنؤ کے چوٹی کے وکیل تھے۔ صوبائی آزادی کے بعد کانگرس حکومت نے یوپی کا ایڈوکیٹ جنرل بنا دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کی طلبی پر کراچی آگئے اور پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل بنا دیے گئے۔ اپنی لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ آئے جس پر بھارت سرکار نے قبضہ کر لیا۔ یہاں صرف تنخواہ پر گزارہ تھا

کئی سال ہوئے دل کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا چکے ہیں۔ چودھری خلیق الزماں ان کے برادر نسبتی ہیں۔

مسٹر نسیم یہ مسٹر وسیم صاحب کے والد تھے۔ لاکھوں کمایا اور دریا دلی سے قوم پر صرف کیا۔ وسیم صاحب کے پاکستان آنے کے بعد یہ بدستور لکھنو میں مقیم رہے وہیں وفات پائی۔ پروفیسر حبیب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور پروفیسر مجیب (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) ان کے صاحبزادے ہیں۔

راس مسعود راس مسعود سرسید کے پوتے۔ ایک مدت تک ریاست حیدرآباد میں ناظم تعلیمات رہے بعد میں ریاست بھوپال میں محکمہ تعلیم سے متعلق رہے اور بہترین خدمات انجام دیں۔

ظہور احمد ۔ ظہور احمد الہ آباد کے کامیاب وکیل اور قومی کارکن تھے۔

خواجہ عبدالمجید خواجہ عبدالمجید۔ لندن میں جواہر لال نہرو کے ساتھی اور علی گڑھ میں شوکت علی کے ساتھی تھے۔ تحریک خلافت میں مردانہ وار حصہ لیا۔ پھر کٹر کانگریسی بن گئے۔ علی گڑھ کے فسادات میں یہ بھی لوٹ مار سے بچ نہ سکے۔ جواہر لال صرف ان سے اظہار ہمدردی کے لیے علی گڑھ گئے۔ چند سال ہوئے وفات پا چکے ہیں۔

سیّد محمود سید محمود۔ علی برادران کے شیدائی اور شاگرد، آل انڈیا خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری کئی سال رہے۔ پھر خلافت کو چھوڑ کر کانگریس سے وابستہ ہو گئے اور اس کے سکریٹری جنرل کئی سال تک رہے۔ اب "مسلم مجلس مشاورت" بنائی ہے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔

منٹو مارلے اصلاحات

پسِ منظر اور ردِّ عمل

(۱)

جو دور (۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۳ء) ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے کئی پہلو ابھی تشنۂ بحث و گفتگو ہیں، من جملہ ان کے منٹو مارلے اصلاحات ہیں۔

سیاسی اصلاحات کی یہ قسط مسلمانوں کے مطالبۂ انتخابِ جداگانہ اور مشہور "شملہ وفد" کے بعد نافذ ہوئی۔ اگرچہ پارلیمنٹ میں وزیر ہند کی طرف سے اس سلسلے میں اظہارِ خیال کیا جا چکا تھا۔

مختصر طور پر ان اصلاحات کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ برطانوی نظام حکومت اور اس کے ماتحت مسلمانوں اور ہندوؤں کی دوسری قوموں اور ملتوں کے احوال و کوائف کا ایک مرقع نظر کے سامنے آجائے۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو لارڈ کیننگ، ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل نے کہ اس سے پہلے تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی تھی اور تمام ادنیٰ و اعلیٰ منصب دار اسی کے ماتحت اور تابع ہوا کرتے تھے۔ الہ آباد میں پہلا دربار شاہی و السرائے (نائب شاہ) کی حیثیت سے منعقد کیا۔ یہی وہ تاریخی دربار ہے جس میں ملکہ وکٹوریہ کا یادگار اعلان پڑھ کر سنایا گیا، یہ اعلان بہت سے ان وعدوں پر مشتمل ہے۔ جنھیں بجا طور پر "شاہی جھوٹ" یا "سیاسی فریب"

کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ اس اعلان میں ببانگ دہل دن کی روشنی میں، اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر اعلان کیا گیا تھا کہ :-

"جہاں تک ممکن ہوگا ہماری رعایا کے ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگوں کو ان کی قابلیت، ذہانت اور لیاقت کے مطابق تمام سرکاری عہدے عطا کیئے جائیں گے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا گیا تھا :-

"قانون چارہ جوئی کرنے میں اور حقوق شہریت اور ملازمت کے حصول میں مذہب کا اختلاف ہرگز خارج نہ ہوگا، جو لوگ اس اصول کو توڑیں گے وہ ہماری خفگی اور سخت سزا کے مستوجب ہوں گے!"

لیکن ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ اصول عام "لوگوں" نے نہیں، خود گورنر جنرل اور وائسرائے اور گورنران صوبہ بلکہ وزیر ہند اور برطانیہ کے وزیر اعظم نے بغیر ندامت کے پوری ڈھٹائی کے ساتھ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ۔ توڑا مگر نہ زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہم سیاسی اصلاحات پر گفتگو کر رہے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبران کی تعداد ۱۶ کر دی گئی۔ یہ کونسل امپریل کونسل بھی کہلاتی تھی۔ ان سولہ ممبران میں پانچ محدود ترحلقہ انتخاب سے منتخب ہوئے تھے۔ پانچ کا انتخاب صوبائی کونسلوں کے غیر سرکاری ممبر اشارۂ سرکار کے مطابق کرتے تھے۔ ایک (یورپین) ممبر کلکتہ کا ایوان تجارت منتخب کرتا تھا۔ اور پانچ ممبروں کو گورنر جنرل اپنی صواب دید پر نامزد کیا کرتا تھا، گویا ۱۶ ممبران کے ایوان میں صرف دس غیر سرکاری ممبر تھے اور وہ بھی لب بند و پابند!

تقریباً یہی کیفیت ان صوبوں کی بھی تھی جن کو کونسل کا مستحق سمجھا گیا تھا۔ مثلاً بمبئی بنگال، مدراس، پھر ۱۸۹۶ء میں یو پی، اور ۱۸۹۷ء میں پنجاب ہائی یا چیف کمشنر کے

صوبے تھے یا انھیں سرزمین بے آئین کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ صوبائی اور مرکزی کونسلوں میں ممبر سوالات کر سکتے تھے۔ لیکن ضمنی سوالات کے حق سے محروم تھے، بجٹ پر اظہار خیال کر سکتے تھے۔ لیکن اس میں ترمیم کے مجاز تھے نہ تنسیخ کے، نہ رائے دینے کے۔ قریب قریب ۱۲ سال تک یہی کیفیت رہی۔

ہندوستان کو جب بھی کچھ ملا، اس میں بیرونی اثرات کی کارفرمائیاں شامل رہیں، ۱۹۰۵ء کی روس اور جاپان کی جنگ میں جاپان کو فتح ہوئی اور روس ہار گیا۔ یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ روس ایک یورپین ملک تھا، اور جاپان ایک ایشیائی ملک، اس فتح و شکست کے نتائج یہ نکلے کہ ایشیائی قوموں میں خودی کا جذبہ ابھرا۔ اور فرنگی قوموں نے اپنے سامراجی منصوبوں میں پوری لچک پیدا کی۔ ہندوستان میں بنگالیوں نے ویسے ہی شور قیامت برپا کر رکھا تھا۔ اب مسلمان بھی انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھے تھے، وہ اپنے حقوق کا تحفظ ضرور چاہتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی آزادی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندوؤں میں تلک اور مسلمانوں میں حسرت موہانی آزادئ ہند کے لیے سربکف تھے۔ تلک صاحب سیاست داں تھے، لہٰذا فرقہ پرستی کے ساتھ ساتھ قوم پرستی کا پرچم لہراتے رہے۔ حسرت موہانی مخلص اور سادہ لوح تھے اس لیے فرقہ پرستی سے دور رہے اور قوم پرستی کا ثبوت لرزہ خیز اذیتیں جھیل کر دیتے رہتے۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات

بہرحال ان حالات میں برطانوی حکومت کو مناسب یہ نظر آیا کہ ہندوستانیوں کو کچھ حقوق دیئے جائیں اور کاروبار مملکت میں وہ تماشائی نہ رہیں۔ چنانچہ لارڈ مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو وائسرائے و گورنر جنرل نے باہمی صلاح و مشورے کے بعد ایک مسودۂ اصلاحات تیار کیا۔ جو ۱۹۰۹ء میں نافذ کر دیا گیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں چند ضوابط بھی اس سلسلے میں منظور کیے گئے۔

۱۹۰۹ء کے "کونسلر ایکٹ" کے مطابق جو سیاسی اصلاحات ہندوستان میں نافذ کی گئیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ مرکزی اور صوبائی مجالس آئین ساز کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ پہلے یہ تعداد ۱۶ نفوس پر مشتمل تھی اب ۶۰ کر دی گئی ان میں سے ۳۵ نامزد اور ۲۵ مختلف انتخابی حلقوں سے منتخب ہوتے تھے۔

نامزد ممبروں میں سرکاری ممبروں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۸ رکھی گئی۔ باقی سات نشستوں میں پنجاب کے زمینداروں یا پنجاب کے مسلمانوں اور ہندوستانی تاجروں میں سے ایک ایک ممبر کی نامزدگی ضروری تھی۔

اب چار نشستیں باقی رہ گئیں یہ تمام تر گورنر جنرل کی صوابدید پر تھیں، اسے حق تھا کسی فنی ماہر کو یا کسی قابل آدمی کو یا چھوٹے فرقوں میں سے کسی شخص کو نامزد کر کے ۶۰ کی تعداد پوری کر دے۔

منتخب ممبروں کی تعداد ۲۵ تھی۔ ان ممبران کا انتخاب بہ طریق ذیل ہوا کرتا تھا

(۱) صوبائی مجالس آئین کے غیر سرکاری ممبروں کی طرف سے	۱۱
(۲) سی پی کی بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے	۱
(۳) صوبائی زمینداروں کی طرف سے	۶
(۴) بڑے صوبوں کے مسلمانوں کی جانب سے	۵
(۵) کلکتہ کے ایوانِ تجارت کی طرف سے	۱
(۶) بمبئی کے ایوانِ تجارت کی طرف سے	۱
میزان	۲۵
نامزد	۳۵
کل میزان	۶۰

۱۹۱۲ء کی اصلاحات ۱۹۰۹ء کے نفاذ اصلاحات کے بعد ۱۹۱۲ء میں جو مزید ضوابط نافذ کیے گئے ان کی رو سے مرکزی انڈین کونسل کی ہیت بایں طور پر قائم ہوئی۔

(الف)(۱) بہ لحاظ عہدہ (ایکس آفیشو) وائسرائے کی کونسل ممبر۔	۶
(۲) کمانڈر انچیف آف انڈیا۔	۱
(۳) صوبے کی کونسل کا صدر، حسب موقع گورنر یا چیف کمشنر	۱
تعداد	۸
(ب) نامزد ممبر برائے مرکزی مجلسِ آئین ساز	
(۱) سرکاری ممبر	۲۸
(۲) زمین دارانِ پنجاب کا نمائندہ	۱
(۳) مسلمانانِ پنجاب کا نمائندہ	۱
(۴) تاجرانِ ہند کا نمائندہ	۱
(۵) گورنر جنرل کی طرف سے نامزد	۲
کل	۳۳
(ج) منتخب ممبران از طرف صوبائی مجالسِ آئین ساز:۔	
(۱) صوبوں کی مجالسِ آئین ساز کے منتخب نمائندے	۱۳/۱۳
(د) مزید منتخب ممبر برائے مجلسِ آئین ساز:۔	
(۱) زمین دارانِ مدراس	۱
(۲) زمین دارانِ بمبئی	۱
(۳) زمین دارانِ بنگال	۱
(۴) زمین دارانِ یو پی	۱

(۵) زمین دارانِ بہار و اڑیسہ ۱

(۶) زمین دارانِ سی، پی ۱

۶

(ھ) مسلمان منتخب ممبران برائے مرکزی مجلس آئین ساز :-

(۱) صوبۂ مدراس ۱

(۲) صوبہ بمبئی ۱

(۳) صوبہ بنگال ۱

(۴) صوبۂ یو پی ۱

(۵) صوبہ بہار و اڑیسہ ۱

۵

(و) مسلمانان منتخب برائے آئین ساز :-

(۱) زمین داران یو پی
(۲) زمین داران بنگال } باری باری سے ۱/۱

(ز) (۱) نمائندہ ایوانِ تجارت بنگال ۱

(۲) نمائندہ ایوانِ تجارت بمبئی ۱

۲

کل میزان ۶۸

گورنر جنرل کی ذاتی صوابدید پر جو چار نشستیں تھیں، ان میں سے دو محفوظ رکھی گئیں اور دو صوبائی مجالس آئین ساز کو دے دی گئیں۔ حسبِ ضوابط ۱۹۱۲ء

۲- مسلمانوں کو جداگانہ حقِ نیابت مل گیا۔

۳- صوبائی مجالسِ آئین ساز کے ممبران میں بھی اس ایکٹ کی رو سے اضافہ کر دیا گیا۔ چنانچہ

(الف) بمبئی، بنگال، مدراس وغیرہ بڑے صوبوں کے ممبرانِ کونسل کی تعداد زیادہ سے زیادہ پچاس ۵۰ کر دی گئی۔

(ب) سی پی وغیرہ چھوٹے صوبوں میں تیس ۳۰ کی تعداد کر دی گئی۔

اصلاحات کی خصوصیت

ان اصلاحات کی خصوصیت یہ تھی:۔

۱۔ (الف) کونسل میں سرکاری ممبران کی اکثریت کا تعامل اور اصول ترک کر دیا گیا۔ مصلحت یہ تھی کہ صوبائی مجالس آئین ساز کو قانون سازی میں بہت سی پابندیوں سے جکڑ دیا تھا۔ لہٰذا غیر سرکاری ممبروں کی اکثریت اور عدم اکثریت سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بہرحال سرکار ہی کی مرضی کے مطابق تمام کام سرانجام پاتے تھے۔

(ب) علاوہ ازیں صوبائی گورنروں کو ویٹو (VETO) یعنی استرداد کا حق حاصل تھا۔ یعنی ان پابندیوں کے باوجود اگر کوئی کونسل حکومت کی مرضی اور مصلحت کے خلاف کوئی تجویز منظور کرے تو گورنر کو حق حاصل تھا کہ اسے مسترد کر دے۔

۲۔ منٹو مارلے اصلاحات ہی کے بعد سب سے پہلے انتخاب اور نیابت کا اصول نہ صرف تسلیم کیا گیا، بلکہ محدود پیمانے پر اسے بروئے کار بھی لایا گیا۔

۳۔ ممبروں کے لیے جو مرکز یا صوبے کی کونسل میں منتخب یا نامزد ہو کر آئیں۔ یہ ضروری تھا کہ "تاج" سے اظہارِ وفاداری کا حلف اُٹھائیں۔

۴۔ "تاج" اور "حکومت" دو الگ الگ اور جداگانہ چیزیں تسلیم کر لی گئیں۔ حکومت کی مخالفت اور اس کی مزاحمت اگر آئینی حدود کے اندر ہو تو قابلِ اعتراض چیز نہیں رہ گئی، البتہ "تاج" کی عظمت کو ان چیزوں سے بالا رکھا گیا۔

۵ :- سنہ ۱۸۹۲ء میں جن سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہوا تھا ان کی رو سے :-

- کونسلوں کو قانون سازی کا حق حاصل تھا - لیکن یہ حق اس لیے بیکار تھا کہ کونسلوں میں اکثریت سرکاری ممبران کی ہوا کرتی تھی اور یہ اکثریت وہی قانون بناتی تھی جو حکومت چاہتی تھی -
- ممبران کی کونسل کے سامنے حکومت کا میزانیہ (بجٹ) پیش کیا جاتا تھا اور وہ اس پر اظہار خیال بھی کر سکتے تھے - لیکن ان کے اظہار خیال سے میزانیہ متاثر نہیں ہوتا تھا - کیونکہ انھیں یہ حق حاصل نہیں تھا کہ بجٹ کو منظور یا مسترد کر دیں، یا کوئی ترمیم پیش کر سکیں - یا تجویز تخفیف اظہار ناراضی کے طور پر ایوان کے سامنے لا سکیں -

لیکن سنہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے نفاذ سے ایک قدم اور بڑھایا گیا - اب :-

- کونسلوں کو اس امر کا مجاز کیا گیا کہ وہ بجٹ پر اچھی طرح تنقید کریں -
- ممبران کونسل کو میزانیہ سے متعلق قرار دادیں اور تجویزیں پیش کرنے کی بھی اجازت دی گئی -

لیکن کوئی فیصلہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا تھا جب تک گورنر انِ کونسل اس کی تصدیق نہ کر دے - بغیر اس کے کسی تجویز پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا تھا -

- کونسل میں سوالات کرنے کی اجازت لیکن اب ایک مزید رعایت یہ دی گئی کہ ہر سوال کرنے والے ممبر کو ایک ضمنی سوال کرنے کی اجازت بھی دی گئی -

(۲)

اصلاحات کا اندرونی پسِ منظر ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ نے کانگریس کی جو طویل اور ضخیم تاریخ لکھی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منٹو مارلے اصلاحات کا عطیہ، جہاں کچھ بیرونی موثرات کا

رہینِ منت تھا۔ وہاں داخلی طور پر بھی حالات ایسے پیش آنے لگے تھے جن کو پیشِ نظر رکھ کر حکومت نے ملک کی اکثریت کو رام کرنا مناسب سمجھا۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں :۔

"۳۰ر اپریل ۱۹۰۸ء کو، دو یم مظفر پور صوبہ بہار) میں دو عورتوں پر گرے یہ بم دراصل مظفر پور کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کنگسفورڈ کے لیئے تیار کیے گئے تھے اور انہی کو نشانہ بنانا مقصود تھا۔ اس جرم میں ایک نوجوان بنگالی کو جس کی عمر ۱۸ سال تھی، پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اس کی تصویر سارے ملک میں تقسیم کی گئی۔

علاوہ ازیں، بھوپندر ناتھ دت ایک بنگالی شخص نے "یوگانتر" کے نام سے ایک پرچہ جاری کر رکھا تھا۔ یہ اپنے پرچے میں علانیہ تشدد کی ترغیب دیا کرتا تھا۔

بھوپندر ناتھ دت کوئی معمولی شخص نہ تھا بلکہ مشہور آفاق ہندو مشینری اور اور خطیب سوامی وویکانند کا بھائی تھا اُسے لمبے عرصے کی سزائے قید ہوئی۔ جس پر اس کی ماں نے رونے دھونے کے بجائے خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور ۵۰ بنگالی عورتیں دت کے گھر پر اس کی ماں کو مبارکباد دینے کے لیے گئیں۔

دت نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے، بڑی بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ کہا:

"ابھی تیس کروڑ ایڈیٹر اس دیس میں اس کی جگہ لینے کے لیے موجود ہیں، "ترانۂ بندے ماترم" کے سلسلے میں آربندا گھوش کی گرفتاری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

۱۳ر جولائی ۱۹۰۸ء کو مہاراشٹر میں بال گنگا دھر تلک گرفتار کر لیے گئے۔ اسی دن اندھرا میں مسٹر ہریش راؤ تھا مارا ؤ اور دوسرے دو اصحاب گرفتار کیے گئے۔ تلک کے مقدمے کی سماعت پانچ روز تک ہوئی۔ اس کے بعد فیصلہ سنا دیا گیا۔ انھیں چھ سال کی سزا دی گئی۔

ہریش راؤ مھاما را وُ دمینن کو نو ماہ کی سزائے قید ہوئی ۔

لیکن حکومت اس سزا سے مطمئن نہیں تھی ۔ اس نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں نگرانی کی درخواست دی اور وہاں سے اس سزا میں اضافہ کردیا گیا ۔ یعنی نو ماہ کی سزا تین سال کی سزائے قید میں تبدیل کردی گئی ۔

سیاسی قتل و غارت کا سلسلہ بھی ۔ جو تشدد کے پرچار کا لازمی نتیجہ تھا، شروع ہو گیا ۔ ۱۹۰۷ء میں سر کورزن وائلی کو لندن میں ایک ہندوستانی نوجوان مدن لال ڈھینگرا نے ایک جلسۂ عام میں قتل کردیا ۔ اسے پھانسی کی سزا ملی ۔

ڈھینگرا کو فرار کرنے کی کوشش میں ایک پارسی پکڑا گیا ۔ جس کا نام مدلکا تھا ۔ اسے بھی وہی سزا ملی جو ڈھینگرا کو ملی تھی، یعنی موت کی سزا ۔

بنگال کی تقسیم اور ہندوؤں کی شورش

تشدد کا یہ سیلِ بے پناہ، یہ باغیانہ طوفان اور یہ شور و شر کیوں تھا؟

اس کا ایک اور صرف ایک سبب تھا ۔ !

بنگال کی تقسیم !

بنگال کے ہندو کسی قیمت پر اسے گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان ان کے دستِ تظلم سے رہائی پا جائیں اس تقسیم کو منسوخ کرانے کے لئے یہ ساری کارروائیاں کی جارہی تھیں اور فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ جب تک بنگال پھر متحد نہیں کردیا جاتا اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔

بنگالی ہندوؤں کی اس شورش میں کانگریس ان کے ساتھ تھی !

اور کانگریس کی پشت پناہی نے دوسرے ہندو صوبوں میں بھی اس کے خلاف جوش و خروش اور غیظ و غضب کی کیفیت پیدا کردی تھی ۔

لارڈ مارلے وزیرِ معتمد، اور لارڈ منٹو وائسرائے آف انڈیا نے اس شورش ،

اس ہنگامہ دار و گیر، اس طوفانِ بلا خیز اور اس شور و شر کا علاج اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھا کہ آئینی اصلاحات کی ایک قسط اور نافذ کر دی جائے۔ مجالس آئین ساز کو کچھ مزید رعائتیں دے دی جائیں۔ ہندو اکثریت کو کچھ اور حقوق عطا کر دیے جائیں لیکن انھوں نے یہ نہ سوچا کہ جس نظام کو جمہوریت کے نام سے وہ ملک میں رائج کر رہے ہیں اور جو بالکل اسی قسم کی جمہوریت ہے جو یورپ میں رائج ہے۔ یعنی اکثریت کی بالادستی اور اقلیت کی اطاعت، اس کی رو سے اور اس کی موجودگی میں۔ ملک کی عظیم اکثریت بظاہر فرقہ پرستی سے بیزار ہونے کے باوجود، کیونکر راضی ہو سکتی تھی۔ اور فرقہ پرستی سے اس کی بیزاری بھی بڑی معنی خیز تھی۔ اسے اعتراض اقلیتوں کی فرقہ پرستی پر تھا۔ خود اپنی فرقہ پرستی کو وہ اعتراض اور نکتہ چینی سے ماورا خیال کرتی تھی۔

حد یہ ہے کہ ہندوؤں کے وہ لیڈر بھی جو اپنی معاملہ فہمی، اصابت رائے، خوش تدبیری اور سیاستدانی کے اعتبار سے اس حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس طوفان میں بہہ گئے۔

مسٹر گوکھلے مسٹر گوکھلے ہندوستان کے ان زعما میں تھے، جن کا احترام اقلیتیں بھی کرتی تھیں۔ ہمارے قائد اعظم بھی، اپنی ساری زندگی میں اگر کسی غیر مسلم یا دوسرے الفاظ میں ہندو زعیم سے متاثر ہوئے تو وہ مسٹر گوکھلے ہی تھے قائد اعظم نے اپنے عہد شباب میں اس پیر دیرینہ سال کی قیادت فخر اور مسرت کے ساتھ قبول کر لی تھی اور اس کے پرچم تلے کام کرنا اپنے لیئے باعث فوز و فلاح و سعادت سمجھ لیا تھا۔

لیکن جب ہندو مسلم سوال پیدا ہوا۔

جب ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کا سوال زیر بحث آیا۔

جب بنگال کی ہندو اکثریت، مسلمان اقلیت سے تقسیم بنگال کے باعث محروم

ہوگئی ۔ تو مسٹر گوکھلے بھی خاموش نہ رہ سکے ۔ وہ بھی ذہن و دماغ اور فکر وعمل کی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں اُتر آئے ، وہ تلک کی طرح مشتعل مزاج اور جذباتی آدمی نہیں تھے ۔ ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے ، لیکن اس موقع پر جذبات کی رو میں بہنے سے انھیں کوئی نہ روک سکا ۔

چنانچہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ منٹو نے آخر مجبور ہو کر کہا :۔

" مجھے مسٹر گوکھلے کی ذہانت اور صداقت پر اعتماد ہے لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے جن سرگرمیوں میں وہ آلودہ ہیں ، اُن کے پیشِ نظر میں ان سے برگشتہ اور مایوس ہوتا جارہا ہوں ۔ ! "

احاطہ (پریسیڈنسی) بنگال ، احاطۂ بمبئی ، اور احاطہ مدراس اس میں گورنر کی ایگزیکٹو کونسل تمام تر انگریز ممبران پر مشتمل ہوا کرتی تھی ۔ ہندوؤں کی دل جوئی کے خیال سے ، یہ روایت بھی بدل دی گئی ۔ اور ہندوستانی (ہندو) ممبروں کے لیے بھی یہ بابِ عالی کھول دیا گیا ۔

لیکن بایں ہمہ حکومت کے خلاف ملک کی اکثریت نے ایک صوبے کی مسلم اقلیت پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیئے جو سر فروشانہ تحریک شروع کی تھی ۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ عین اس وقت جب لارڈ منٹو ، مسٹر گوکھلے کی انتہا پسندی پر جز بز ہو رہے تھے ۔ مسٹر گوکھلے فرما رہے تھے :

" (حکومت کی حکمت عملی کے نتیجے کے طور پر) تشدد کے باعث اصلاحات سیاسی (منٹو مارسلے ریفارمس) اپنی نصف قیمت اور تمام خوبی ضائع کر چکی ہیں "

ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ بنگال کے دہشت پسندوں کی حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

" عوام میں حکومت کے خلاف جذباتی زوروں پر تھے اور لارڈ منٹو نے لارڈ کرزن کی سخت گیر پالیسی کے برے اثرات کو محسوس کر دیا تھا ۔ چنانچہ

انھوں نے ایک مرتبہ پھر ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کی وضاحت کی ۔ "

اس کے بعد عدم تشدد کا یہ پرستار نہ صرف اپنے آپ کو نہ صرف کانگریس کو بلکہ عدم تشدد کے نظریے اور عقیدے کو بے نقاب کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہتا ہے :

"لیکن جب تک تقسیم بنگال کا سوال تسلی بخش طور پر حل نہ ہو تا کسی قسم کے امن کی توقع ہی فضول تھی ۔"

یعنی جب تک مشرقی بنگال، مغربی بنگال کی ہندو اکثریت کا پھر سے تابع نہ بنا دیا جاتا، اور ہندو اکثریت کو مشرقی بنگال کی بے مایہ مسلم اقلیت کے تمام انسانی اور بنیادی حقوق غصب کر لینے کی مکمل اجازت نہ دے دی جاتی، اس وقت تک امن کی توقع ہی فضول تھی ۔

تقسیم بنگال کو جب انگریزوں نے منسوخ کر دیا تو بھی ہندو پورے طور سے مطمئن نہیں ہوئے ۔

ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ نے اپنی تاریخ کانگریس میں لکھا ہے ۔

"کلکتہ کے اجلاس کانگریس میں (۱۹۱۱ء) سر بیندر ناتھ بنرجی نے ہندوستان بھر کی اس امداد کا اعتراف کیا جو اس نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کے سلسلے میں کی تھی ۔ اس عارضی مسرت کے دوران میں لوگ سرلیش ایکٹ (۱۹۰۸ء) اور پریس ایکٹ اور قانون ترمیم ضابطہ فوجداری (۱۹۱۰ء) کو فراموش نہ کر سکے ۔ جو شجر آزادی کے لیے تیشے کی حیثیت رکھتے تھے ۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں میں جو ریگولیشن نافذ تھے ۔ جن کی رو سے لوگوں کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جلا وطن کرنے ، نظر بند کرنے اور پابند کرنے کا حکومت کو اختیار حاصل تھا ۔ تشویش اور اضطراب کا سبب بنے ہوئے تھے ۔"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :۔

"۱۹۱۲ء میں (تقسیم بنگال کے بعد) حالات ذرا خوش گوار ہوئے ، لیکن اس

سال لارڈ ہارڈنگ وائسرائے آف انڈیا پر بم پھینک کر انھیں قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کانگریس نے اپنے اصول کے مطابق وائسرائے کو تار بھیجا جس میں اس فعل کی مذمت کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد پریس پر مزید پابندیاں لگادی گئیں۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں پریس ایکٹ کو منسوخ کردینے کا حکومت سے مطالبہ کیا گیا۔

مسٹر بھوپندر ناتھ باسو نے اس تجویز پر تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں پریس کی سرگرمیوں اور کارروائیوں کی تاریخ کا ایک مختصر سا جائزہ لیا اور بتایا کہ اس طرح سر چارلس مٹکاف نے پریس کو آزادی دے کر ہندوستانیوں کا دل موہ لیا تھا، مگر بعد میں حکومت نے یہ آزادی چھین لی، اور پریس ایکٹ منظور کرکے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومت کو پرانے (جاری شدہ) اخبارات سے پانچ ہزار اور نئے (جاری کیے جانے والے) اخبارات سے دو ہزار تک کی نقد ضمانت طلب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ کانگریس کے زبردست احتجاج پر سر ہربرٹ نے جو ہوم ممبر (گورنمنٹ آف انڈیا) تھے فرمایا کہ اس ایکٹ سے پرانے اخبارات کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا اور قانون کا دروبست پولیس کے ہاتھ میں نہیں ہوگا۔ مگر ان دونوں وعدوں کا ایفا نہیں کیا گیا۔ خفیہ پولیس کی معمولی شکایت پر اخبارات سے ضمانت طلب کرلی جاتی تھی۔ مولانا محمد علی نے ایک پمفلٹ، "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" شائع کیا اور حکومت کی منظوری حاصل کیے بغیر، جیسا کہ ایکٹ کی رو سے ضروری تھا اسے ضبط کرلیا گیا، حالانکہ یہ پمفلٹ باغیانہ نہیں تھا اور ضابطہ فوجداری کی زد سے باہر تھا۔!"

اس سلسلۂ بحث میں ڈاکٹر صاحب نے مزید ارشاد فرمایا:

"مسز اینی بسنٹ کے اخبار "نیو انڈیا" سے ضمانت طلبی اور رقم ضمانت کی ضبطی کا واقعہ ہی اس طرح کا ہے، اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے مدراس کے قائم مقام چیف جسٹس نے اس ضبطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"پریس ایکٹ کی دفعہ ۳، پرنٹنگ پریس رکھنے والوں کے لیئے حد درجہ نقصان دہ ہے۔!"

چنانچہ جب پریس ایسوسی ایشن کا ایک وفد جو مسٹر ہارنی مین، پنڈت مالوی، مسٹر چنتامنی اور مسٹر سچدآنند سنہا وغیرہ پر مشتمل تھا، وائسرائے کے حضور میں باریاب ہوا، تو وائسرائے نے نہ صرف وفد کو سخت سست سنائی، بلکہ ججان ہائی کورٹ پر بھی بری طرح برسا۔ اس نے کہا:۔

"ججوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ہمیں بتائیں قانون کیسا ہے؟ انھیں صرف یہ دیکھنا اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے کہ قانون کیا ہے؟"

حکومت کا ہندوؤں سے ترجیحی سلوک

ان تفصیلات سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اگرچہ فرنگی حکومت، ہندوؤں کی امن شکن، باغیانہ اور تشدد آمیز سرگرمیوں سے خفا تھی، لیکن انھیں خوش رکھنے کی تدبیر بھی کرتی رہتی تھی، لیکن انھیں خوش رکھنے کی تدبیر بھی کرتی رہتی تھی، تامل اور اظہار برہمی و عتاب کے باوجود ان کے مطالبات جلد یا بدیر مان لیتی تھی اور ہر قیمت پر ان کا تعاون حاصل کرنے کی جویا رہتی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہے لہٰذا انہی کو خوش رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ہندوؤں کو خوش رکھنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اس نے۔

- بمبئی، بنگال اور مدراس کے گورنروں کی ایگزیکٹو کونسل کے دروازے ہندوستانیوں کے لیے بھی از راہِ لطف و کرم کھول دیے۔

- ہندو لیڈروں کی زہر آلود اور تشدد کی ترغیب دینے والی تقریروں اور تحریروں پر اگرچہ اظہار عتاب کیا، لیکن، ان کی دل جوئی اور خاطر داشت میں بھی کوئی کمی نہیں کی،
- بڑے بڑے ہندو لیڈروں۔ مثلاً مسٹر گوکھلے وغیرہ۔ کی خوشامد کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور انھیں رام کرنے کی تدبیریں بھی کیں اور ان کے ساتھ مشفقانہ رویّہ بھی رکھا۔

مسلمانوں سے حکومت کا غیر منصفانہ رویّہ

لیکن جو مسلمان۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی کانگریس میں شریک تھے مثلاً حسرت موہانی، یا جو حکومت کے مخالف تھے۔ مثلاً محمد علی، ان کے ساتھ جتنی زیادہ سختیاں کی جاسکتی تھیں کی گئیں۔ اس لیے کہ وہ اقلیت میں تھے اور حکومت نہ ان سے خائف تھی نہ ان کی دل جوئی کی فکر تھی۔

چنانچہ جیسا کہ ڈاکٹر سیتارامیہ نے بیان کیا ہے۔ ایکٹ کی دفعات کے خلاف اور حکومت سے منظوری لیے بغیر انتظامیہ نے محض اپنے اختیارات سے کام لے کر محمد علی کے شائع کردہ پمفلٹ "مقدونیہ آؤ، اور ہماری مدد کرو" ضبط کر لیا، حالانکہ یہ نہ باغیانہ تھا نہ ضابطۂ فوجداری کے ذیل میں آتا تھا، پھر محمد علی نے جب کلکتہ ہائی کورٹ میں اس خلاف قانون اقدام کے خلاف چارہ جوئی کی، تب بھی ان کی دادرسی نہ ہوسکی، اس لیے کہ ایکٹ میں اسے مجروح کر کے من مانی کرنے کے اتنے وسیع اختیارات حاصل تھے کہ عدالت عالیہ ان میں مزاحم نہیں ہوسکتی تھی اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ججوں کا کام یہ نہیں تھا کہ قانون کے حسن و قبح پر بحث و گفتگو کریں۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں، خواہ قانون کیسا ہی ہو۔

دوسرا موقعہ حسرت موہانی کا ہے۔

حسرت سے ان کی بے بضاعتی کے باوجود اور ان پر پریس کے کم مایہ ہونے کے باوجود ضمانت کی انتہائی رقم طلب کی گئی۔

- سزائے قید دی گئی۔
- اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا۔
- چکّی کی مشقت سے نوازا گیا۔
- جرمانہ کیا گیا۔
- اور چونکہ اس فقیر سے جرمانہ نہیں وصول کیا جا سکتا تھا لہٰذا اس کی عمر بھر کی علمی اور ادبی کمائی، یعنی اس کا بیش قیمت کتب خانہ صرف ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ تشدّد کی ترغیب دینے اور تشدّد کی پالیسی پر عمل کرنے کے باوجود انگریز حکومت ہندوؤں کی نیاز مندیوں پر کیوں اپنے تئیں مجبور پاتی تھی اور مذکورہ جرائم سے ہلکے جرم میں مسلمانوں کے ساتھ شیر کیوں ہو جاتی تھی، کیا اس کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ اکثریت کو ہر حال میں وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی اور اقلیت کو اگر وہ سر اُٹھائے ۔ خواہ اکثریت کی ہمنوائی میں سہی ۔ کچل ڈالنے کا فیصلہ کر چکی تھی ۔ !

گزشتہ ابواب میں مولانا حسرت موہانی کی حیات زنداں پر کافی تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے ۔ اس موقع پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ رہائی کے بعد جب اپنے رسالے اُردوئے معلیٰ میں حسرت نے "مشاہدات زنداں" کے عنوان سے اپنے جیل کے تجارب اور احوال اور حکومت کے جبر و ستم کی داستان قسط وار لکھنا شروع کی تو لکھنؤ کے ایک کانگریسی لیڈر مسٹر گنگا پرشاد ورما نے جو یوپی کونسل کے ممبر بھی تھے سوال کیا:

"آیا گورنمنٹ کی نظر سے اُردوئے معلیٰ کے یہ مضامین گزرے ہیں؟ اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی؟"

حکومت کی طرف سے جواب دیا گیا:

"گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے، ان کے بارے میں تحقیقات کی گئی ہے نہ کی جائے گی۔"

اس جواب میں جو فرعونیت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ۔

گنگا پرشاد نے بھی سوال اگر کسی اکثریتی لیڈر کے یا اس کی تحریروں کے بارے میں کیا ہوتا تو یقیناً تحقیقات کا وعدہ کر لیا ہوتا ۔ !

غرض سیاسی اصلاحات سے بھی عملی فائدہ اگر حاصل ہوا تو صرف اکثریت کو۔ ورنہ اقلیت پسماندہ اور درماندہ ہی رہی ، لیکن اس حوصلہ شکن طرز عمل کے باوجود اس نے ہمیشہ اور ہر موقع پر حب وطن کا ثبوت دیا ۔ کبھی اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور اس کا صلہ اکثریت کے دربار سے یہ ملا کہ اس کی انفرادیت تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا گیا اس کے حقوق کبھی تسلیم نہیں کیے گئے ۔ اس کی شکایات کو ہمیشہ طومار خرافات قرار دیا جاتا رہا اور " فرقہ پرستی کو گالی بنا لیا گیا ۔ اور یہ گالی تواتر و تسلسل کے ساتھ تقریباً سو برس تک اسے پبلک پلیٹ فارم پر، اور اخبارات کے صفحات پر دی جاتی رہی !

ہندوستان میں ہر دس پندرہ سال کے بعد سیاسی اصلاحات نافذ ہوتی رہیں ایسے ہر موقع پر اگر کسی نے واقعی اور حقیقی فائدہ اٹھایا تو وہ اکثریت ہی تھی ۔ اور اگر کسی نے واقعی اور حقیقی نقصان اٹھایا تو وہ " فرقہ پرست مسلم اقلیت " تھی !

مزید شواہد اگلے ابواب میں حسب موقع پیش کیے جائیں گے ۔

مسلمان انقلاب پسند

(۱)

انگریزوں نے حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی۔ انگریزوں کے دور میں سب سے زیادہ مادی نقصان مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔ اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال تک جاہ و جلال کے ساتھ مسلمانوں نے حکومت کی تھی، لیکن جب حکومت ان کے ہاتھ سے چھنی تو ان کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی تھی۔ ان کے بادشاہ پر اسی قلعے میں "بغاوت" کا مقدمہ چلایا گیا۔ اور اسے جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ مرتے دم تک فقر و فاقے کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ان کے بہت سے اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا۔ اور انھیں من مانے مصارف پر صرف کیا گیا، ان کی تہذیب، ثقافت اور روایات کے خلاف متواتر اور مسلسل اقدامات کیے گئے۔ ان کی زبان کو "قتل" کرنے کی ناروا کوشش کی گئی، جو صدیوں کی محنت اور کد و کاوش اور اتحاد باہمی کا نتیجہ تھی۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ جاگیروں پر قبضہ کر لیا گیا۔ عمارتیں ڈھا دی گئیں۔ مکاتب اور مدرسے بند کر دیے گئے۔ تعلیم اور ترقی کا راستہ ان کے لیے مسدود کر دیا گیا۔ ان کی شاندار حویلیاں کوڑیوں کے مول نیلام کر دی گئیں۔ انھیں نہ صرف معتوب و مقہور قرار دیا گیا، بلکہ ہر طرح سے

ذلیل کیا گیا۔ ان کی مزید تذلیل اس طرح کی گئی کہ ہندوؤں کو ان کے مقابلے میں بڑھایا گیا۔ ان کی پیٹھ تھپکی گئی۔ ان کے لیے تعلیم و ترقی کے دروازے کھول دیے گئے، ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں، لہٰذا آخر کار اس ملک کی حکومت انہی کے ہاتھ میں آئے گی۔ اور مسلمانوں کو نیز دوسری اقلیتوں کو ان کا ماتحت اور تابع بن کر رہنا ہوگا۔

یہ بڑی زہرہ گداز اور جگر خراش صورت حال تھی، لیکن مسلمانوں نے صبر سے کام لیا۔

اپنی تذلیل اور ان لوگوں کو ــــ

"نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور"

سربلند دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کڑھتے تھے، لیکن اب تک صبر و ضبط کا سررشتہ انھوں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

معاملات صرف یہیں پر آکر ختم نہیں ہو گئے۔

حکومت برطانیہ نے مقامات مقدسہ، عتباتِ عالیات اور حرمین شریفین کو بھی اپنا ہدف بنانا چاہا۔

اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو عظیم و جلیل اسلامی حکومتوں۔ ایران و ترکیہ ــ کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ بھی کر لیا تھا۔

ان حالات میں اور اس فضا میں مسلمان خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

چنانچہ وہ عرصۂ عمل میں آئے۔

جو لوگ میدانِ کار میں اترے وہ دو طرح کے تھے۔

پہلا گروہ ایک وہ لوگ تھے جو حکومت برطانیہ کا مقابلہ اس طرح کر رہے تھے کہ اس کے خلاف جلسے کرتے تھے، جلوس نکالتے تھے، احتجاجی تجویزیں

پاس کرتے تھے۔ اس کے طرزِ عمل دربارۂ اسلامیانِ ہند و عالم اسلام پر گرمیِ گفتار کا مظاہرہ کرتے تھے، اخبارات نکالتے تھے، اور ان اخباروں میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے تھے۔ ضمانت طلب کی جاتی تھی، ضبط کرلی جاتی تھی۔ لیکن یہ مرنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے!

یہ لوگ ہندوستان کے باہر، حکومت کو اور اس کے وزراء کو ان کی غلط کاریوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔ وفد بنا کر شرف باریابی حاصل کرتے تھے۔ اور نائب السلطنۃ (وائسرائے) اور وزرائے برطانیہ کے سامنے نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر کلمۂ حق بلند کرتے تھے، نظر بندی، گرفتاری، سزایابی، ضبطی املاک و جائداد، قرقی اور ہر طرح کی تباہی و بربادی کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن مسلح بغاوت کا تصور ان کے دائرۂ کار سے خارج تھا۔

اسی طرح دوسرے دشمن ممالک سے ساز باز کر کے ہندوستان کے برطانوی راج کو ختم کر دینے اور اس کا تختہ الٹ دینے کا منصوبہ بھی ان کے طریقۂ کار میں شامل نہیں تھا۔

ان کی ساری سرگرمیاں اعلانیہ تھیں، پس پردہ کسی طرح کی کارروائی کے یہ قائل نہیں تھے۔

حکومت سے اور ان سے مقابلے ہوتے رہتے تھے اور ان رزم آرائیوں میں جیت کبھی حق کی ہوتی تھی، کبھی باطل کی۔

دوسرا گروہ

لیکن ایک جماعت اور بھی تھی، !

یہ جماعت آئینی حدود کے اندر رہ کر کام کرنے کی قائل نہیں تھی۔

یہ انگریزوں سے متنفر تھی!

انگریزوں کی ستم آرائیوں اور فتنہ سامانیوں نے اس کے دل میں ان کی ذرا بھی

گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ انگریزی حکومت کو ہر قیمت پر اور جملہ ممکن وسائل سے کام لے کر اس کا تختہ الٹ دینا ان کا مقصد حیات تھا۔ یہ مسلح بغاوت کے بھی قائل تھے اور دشمن ممالک سے ساز باز کر کے انقلاب برپا کرنا بھی ان کا مقصد و منہاج تھا۔

مسلمانوں کا حال زار دیکھ کر، اور عالم اسلام پر برطانیہ کی دراز دستیوں کا معائنہ کر کے یہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس موذی دشمن کو جائز اور ناجائز آئینی اور غیر آئینی امن پسندانہ اور متشددانہ، ہر طریقے سے ختم کرنا چاہیے۔

جب تک یہ دشمن ختم نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک نہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سکھ اور چین کی نعمت مل سکتی ہے، نہ عالم اسلام امن و امان اور عافیت کی سعادت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

ان کی نظر میں "ہندو اکثریت" ایک حقیر اور بے مایہ چیز تھی۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت اور رسوائی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ ہندو اکثریت سے ڈریں ان کا خیال تھا کہ اگر حالات سازگار ہوں، تو اب بھی یہ ماضی کی تاریخ کو دہرا سکتے ہیں اور اس دیش پر جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ حکومت کر سکتے ہیں۔

بنگال کی دہشت پسند اور انارکسٹ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کانگریس، ہندوؤں کی کثرت تعداد ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے یہ خائف ہوتے، جسے یہ خاطر میں لاتے، اور جو ان کا راستہ روک سکتی۔

اسی یقین و اذعان کا سرمایہ لے کر ظاہری ساز و سامان سے محرومی کے باوجود یہ اٹھ کھڑے ہوئے، انھیں اپنے فہم و خرد پر، اپنی تدبیر و سیاست پر، اپنے دست و بازو پر، اپنی حکمت و دانائی پر پورا بھروسہ تھا۔ اتنا زیادہ بھروسہ تھا کہ بغیر کسی اندیشے اور وسواس کے ہر طرح کے خطرات و خباثت کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ گھر سے نکل پڑے

پہلی جنگِ عظیم اور ترک پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی، ترکوں

نے اس جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ترکوں سے زیادہ انگریزوں کی دسیسہ کاریوں اور مکروکید سے کون واقف ہو سکتا تھا، برطانیہ کا ساتھ دے کر وہ اپنے محضر قتل پر دستخط کیوں کرتے؟ انگریزوں کے خلاف انھوں نے اعلانِ جنگ کر دیا اور جرمنی کے اتحادی بن گئے۔

مسلم زعما کا نقطۂ نظر

مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا ظفر علی خاں، اگرچہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ترک انگریزوں سے لڑیں اور جرمنوں کے اتحادی بن جائیں۔ لیکن حقائق سے وہ بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے، ترکوں کی مخالفت کرنا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ انھوں نے اگرچہ انتہائی حد تک محتاط روش اختیار کی۔ لیکن برطانوی حکومت ان چیزوں سے مطمئن نہیں ہوئی، پہلے محمد علی شوکت علی نظر بند کیے گئے پھر دوسرے اکابر کی باری آئی، ان کے اخبارات سے بھی ضمانتیں طلب ہوئیں، اور وہ بند ہو گئے۔

علی برادران کی نظر بندی

علی برادران کی رہائی کے لیے مسز اینی بسنت نے بھی بہت زور لگایا، لیکن ایک نہ سنی گئی ان کا جرم تک نہیں بتایا گیا کہ آخر یہ طویل نظر بندی ہے کس خطا پر؟۔

الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے!

آخر جب مسٹر جناح (بعد میں قائداعظم) نے زیادہ شدید لہجے میں حکومت سے مجلس آئین ساز میں سوال کیا تو جواب میں صرف یہ فرمایا گیا:

"یہ دونوں بھائی بلکہ معظمہ کے دشمنوں کے ہمدرد اور دوست ہیں اس لیے ان کی نظر بندی عین تقاضائے مصلحت ہے۔"

مسلح انقلاب پسند مسلمان

علی برادران کی نظر بندی اور گرفتاری پہلی جنگ عظیم کے اثرات و نتائج اور حالات

ماقبل و مابعد ایک بسیط مقالے کے طالب ہیں۔ جس کا یہ باب متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں نہ صرف مسلح انقلاب پسندوں کا مختصر طور پر ذکر کرنا مقصود ہے، تاکہ دنیا اس حقیقت کو جان لے کہ ہندو انقلاب پسندوں اور انارکسٹوں سے کہیں زیادہ جرأت، جوش، ہمت اور دلیری کے ساتھ مسلمان انقلاب پسندوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں قدم رکھا تھا۔ اور ان میں کچھ ایسا خلوص اور کچھ ایسا بانکپن تھا کہ کئی ہندو بھی ان کے قدم بہ قدم چلنے پر اپنے تئیں مجبور پانے لگے۔

مسلمان انقلاب پسند

اور

سر سڈنی رولٹ تحقیقاتی رپورٹ

(۲)

۱۹۱۸ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمس فورڈ نے وزیر ہند کی منظوری اور اپنی اگزیکٹیو کونسل کی صلاح سے سر سڈنی رولٹ کی زیر صدارت ایک کمیٹی قائم کی۔

اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ انقلابی تحریکوں، باغیانہ سرگرمیوں اور مجرمانہ سازشوں کے بارے میں اصل واقعات وحقائق کی چھان بین کی جائے۔

اس کمیٹی میں پانچ ممبر یورپین تھے اور دو ہندوستانی جن میں ایک مدراس کا تھا، ایک بنگال کا، ممبرانِ کمیٹی میں ہائی کورٹ کے تین جج بھی تھے۔

رولٹ کمیٹی نے تین مہینے کی محنت شاقہ کے بعد خفیہ پولیس کی رپورٹوں، بعض مجرموں کے بیانوں، سنسر اور سرکاری گواہوں کی شہادتوں کو سامنے رکھ کر یہ رپورٹ مرتب کی۔

رولٹ رپورٹ پر تفصیلی تبصرہ کرنے کا یہ وقت نہیں اس کے لیے ایک مستقل باب درکار ہے لیکن اس کار خاص میں اس نے جو تحقیقاتی مواد فراہم کیا اور جسے حکومت نے شائع کر دیا وہ چونکہ حد درجہ معلومات آفریں ہے اس لیے اس کے

کچھ حصے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ریشمی رومال کی سازش

رپورٹ میں مرقوم ہے:-

"۱۰ اگست ۱۹۱۶ء میں وہ سازش منظرِ عام پر آئی جو حکومت کی فائلوں میں "ریشمی رومال" کی سازش کے نام سے معروف ہے۔

اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان پر شمال مغربی سرحد سے ایک بھرپور حملہ کیا جائے اور جیسے ہی یہ حملہ ہو ہندوستان کے مسلمان جہاد کے لیے کمربستہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں، اور اس طرح بڑی آسانی سے اور مختصر مدت میں حکومت برطانیہ کا اقتدار اعلیٰ اس ملک سے ختم کر دیا جائے۔"

مولانا عبیداللہ سندھی

"اس تجویز کو کس طرح روبہ عمل لایا جائے اور اسے کیوں کر عملی جامہ پہنایا جائے؟ اس سلسلے میں ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ جن کے نام عبداللہ، فتح محمد، اور محمد علی تھے، اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔

یہ شخص عبیداللہ (مولانا عبیداللہ سندھی) سکھ مذہب کو ترک کر کے مسلمان ہو گیا تھا اور صوبہ متحدہ یوپی کے ضلع سہارنپور کے ایک قصبے کے دینی مدرسے "دارالعلوم دیوبند" سے اس نے سند فضیلت حاصل کی تھی۔

یہ شخص وہاں بھی حکومت کے خلاف تحریک چلایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے برطانیہ کے خلاف دارالعلوم کے عملے کے کچھ اساتذہ اور طلبا کو

اپنا ہم خیال بنا لیا جس سے ایک بڑی ہستی جو اس سے متاثر ہوئی، وہ محمود حسن (شیخ الہند مولانا محمود حسن) کی تھی، جو دارالعلوم کا صدر مدرس تھا

عبید اللہ کی خواہش اور آرزو یہ تھی کہ ہندوستان کے اندر حکومت برطانیہ کے خلاف دارالعلوم دیوبند کے طلبا اور اساتذہ کی رفاقت اور معیت میں ایک ہمہ گیر جذبہ پیدا کر دیا جائے، اور ایک ایسی تحریک چلائے جو سارے ملک میں انقلاب پیدا کر دے۔"

دارالعلوم دیوبند سے اخراج

"لیکن اس کی یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ دارالعلوم کے مہتمم (مولانا محمد احمد، مولانا طیب صاحب موجودہ مہتمم دارالعلوم کے والد ماجد) اور دوسرے لوگ سدراہ ہوئے، انھوں نے عبید اللہ اور اس کے ساتھیوں کو دارالعلوم سے برخاست کر دیا۔

دارالعلوم سے برخاست ہونے کے بعد عبید اللہ مالی دشواریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا، لیکن وہ اپنے منصوبے سے باز نہیں آیا اور مولانا محمود حسن کے پاس برابر آتا رہا۔

مولانا محمود حسن کے مکان پر پوشیدہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کچھ سرحدی لوگ بھی ان جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔"

شیخ الہندؒ کی حجاز کو روانگی

"۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے ایک شخص محمد میاں کو سرحد پار روانہ کر دیا۔ اور خود اپنے چند شاگردوں اور دوستوں کے ساتھ ہندوستان کی اقامت ترک کر کے حجاز مقدس روانہ ہو گیا۔ اسی زمانے میں

عبیداللہ نے دہلی میں (مسجد فتح پوری میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کو عربی پڑھانے اور علوم اسلامیہ سے روشناس کرانے کے لیے) ایک مدرسہ قائم کیا اور دو کتابیں شائع کیں جن میں مسلمانوں کو جہاد کی اور قتال کی تلقین کی گئی تھی۔ عبیداللہ کا اور اس کے دوستوں کا جن میں (مولانا) محمود حسن بھی شامل تھا، صرف ایک مقصد تھا وہ یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جہاد و قتال کا جذبہ زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ پیدا کر دیا جائے، تاکہ وہ انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔"

اب ان مساعی کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان لوگوں نے اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرانجام دیں،

افغانستان میں مولانا عبیداللہ کی مساعی

"عبیداللہ اور اس کے ساتھی پہلے تو ہندوستان میں ان لوگوں کے پاس گئے جو مذہبی جوش و جذبہ دیوانگی کی حد تک رکھتے تھے۔ اس کے بعد یہ لوگ کابل پہنچ گئے۔ وہاں یہ لوگ ترکی جرمن مشن کے ممبروں سے ملے۔ ان سے تبادلۂ خیال کیا، اسی اثنا میں (مولانا) محمود حسن کا فرستادہ محمد میاں بھی یہاں پہنچ گیا، پہلے یہ شخص (مولانا) محمود حسن کے ساتھ عربستان گیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں حجاز کے ترکی گورنر غالب پاشا نے جو اعلان جہاد عام شائع کیا تھا اسے لے کر یہ شخص کابل آیا۔ راستے میں اس جہاد نامے کی نقلیں تقسیم کرتا رہا۔"

مولانا عبیداللہ کا منصوبہ "عبیداللہ اور اس کے ساتھیوں کی تجویز

یہ تھی کہ حکومت برطانیہ کو ہندوستان سے فنا کرنے کے بعد وہاں ایک عارضی قومی حکومت قائم کی جائے، وہاں کا ایک اور شخص راجا مہندرا پرتاب سنگھ (یہ صاحب علی گڑھ کالج کے گریجویٹ ہیں۔ یوپی کے تعلقداروں میں سے تھے مسلم تہذیب، معاشرت اور تمدن سے اتنے متاثر تھے کہ بے تکلف مسلمانوں کی نماز باجماعت میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ آزادئ ہند کے بعد انھیں وطن واپس آنے کی اجازت ملی ابھی تک زندہ ہیں بے حد بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنی وضع پر اب تک قائم ہیں۔) عارضی حکومت کا صدر تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو، خود سر اور توہم پرست تھا۔ ۱۹۱۴ء میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس کا پاسپورٹ مل گیا۔ چنانچہ یہ سیدھا جنیوا پہنچا وہاں یہ ہردیال سے ملا (لالہ ہردیال بھی ایک زمانے میں مسلمان انقلاب پسندوں کے دستِ راست بلکہ آلۂ کار رہے۔ بعد میں خود ساختہ جلاوطنی کی گھڑیاں نہ جھیلی گئیں حکومت برطانیہ سے صلح کر کے ہندوستان واپس آ گئے اور یہاں ہندو مہاسبھا کے رکن بن گئے۔ انھوں نے ایک مضمون میں مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندو مت قبول کر لیں، علمار نے اس کے جواب میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا مجذوب کی بڑ۔) ہردیال نے راجا مہندرا پرتاب سنگھ کا تعارف جرمن سفیر سے کرا دیا۔ جس کے بعد یہ برلن چلا گیا۔

مولانا عبیداللہ کی ذہانت کا اعتراف

"ایک شخص جو عبیداللہ کو اچھی طرح جانتا تھا (غالباً لالہ ہردیال ہی

ہوں گے) اس کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ تجاویز تیار کرنے میں اسے غیر معمولی کمال حاصل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے واقعی وہ کسی بڑی سلطنت کا فرماں روا ہے۔ یہ بھی بعد میں جرمنی پہنچ گیا کیونکہ اس نے جرمنوں کو اپنی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر کرلیا تھا، اور وہ اسے بہت ماننے لگے تھے۔

عبیداللہ کے بارے میں یہ طے ہو گیا تھا کہ آزاد ہندوستان کی کابینہ کا ایک با اثر ممبر ہوگا۔"

برکت اللہ بھوپالی

"غدر پارٹی کا ایک رکن۔ اور کرشنا ورما کا دوست اور ساتھی برکت اللہ بھی ان سرگرمیوں میں شریک تھا اس کے بارے میں یہ طے ہوا تھا کہ اسے آزاد ہندوستان کا وزیر اعظم بنایا جائے گا۔

برکت اللہ بھوپال ریاست کا رہنے والا اور ایک معمولی شخص کا بیٹا تھا۔ اس شخص نے جاپان، امریکہ اور انگلستان کی سیاحت بھی کی تھی، یہ شخص ٹوکیو میں اردو زبان کا پروفیسر تھا۔ ٹوکیو سے اس نے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا جو از اول تا آخر برطانیہ کے خلاف معاندانہ مواد پر مشتمل ہوتا تھا۔ کچھ عرصے بعد جاپان کے حکام نے اس اخبار کی اشاعت پر پابندی لگادی، اور یہ بند ہوگیا۔ بعد ازاں یہ پروفیسری کے منصب سے بھی سبکدوش کردیا گیا۔ اور جاپان سے رختِ سفر باندھ کر امریکہ چلا گیا اور وہاں اپنے غدر پارٹی کے ممبر دوستوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔"

(مولانا برکت اللہ بھوپالی بڑے قابل اور مجاہد صفت شخص تھے۔ انھوں نے ملک اور ملت کے لیے جو مصیبتیں جھیلیں آج ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جواہر لال نہرو ایک مرتبہ دورہ یورپ کے زمانے میں ان سے ملے تھے اور ان سے بہت متاثر ہوئے تھے، ان کے جذبۂ ایثار و قربانی سے بھی اور ان کے جوش کار سے بھی۔ انھوں نے کھلے الفاظ میں بڑے دکھ کا اظہار کیا تھا کہ اس پائے کے لوگ وطن سے دور وطن کے لیے مصائب جھیل رہے ہیں۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کا انتقال آزادئ ہند سے پہلے غالباً ۱۹۲۵ء میں یہ عالم جلاوطنی ہوگیا۔ گویا ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

وہ جرمن جو اپنے مخصوص مقاصد کے لیے افغانستان وارد ہوئے تھے جب اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو چار و ناچار انھیں واپس چلا جانا پڑا، چنانچہ ۱۹۳۶ء میں یہ لوگ واپس چلے گئے، لیکن جو ہندستانی اپنے ملک سے کابل گئے تھے وہ بدستور وہیں مقیم رہے۔"

زارِ روس کے نام خط

"عارضی حکومت کے ممبروں نے افغانستان میں اپنا کام برابر جاری رکھا۔ چنانچہ انھوں نے روسی ترکستان کے فرماں روا، اور زارِ روس کو مراسلے بھیجے کہ یہ دونوں برطانیہ عظمیٰ سے دوستی کا پیمان شکست کر دیں اور اس سلطنت کو مٹانے کی سعی و کوشش میں مدد کریں۔ یہ خطوط کسی نہ کسی طرح برطانیہ کے ہاتھ آ گئے، زارِ روس

کے نام جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کے پتر پہ لکھا گیا تھا۔ اس کی عکسی تصویر ہم نے بہ چشم خود دیکھی ہے۔"

ریشمی رومال کی سازش

"اس عارضی حکومت نے جو کابل میں بیٹھی کام کر رہی تھی ایک اور اقدام یہ کیا کہ اس کے ایک رکن عبیداللہ نے ترکی حکومت سے رابطہ اتحاد پیدا کرنے کے لیے اپنے دیرینہ رفیق کار (مولانا) محمود حسن کو واسطہ بنایا۔

یہ خط اور ایک دوسرا خط ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو محمد میاں انصاری نے حیدرآباد سندھ کے ایک شخص عبدالرحیم کو ایک ہدایت نامے کے ساتھ بھیج دیا۔

یہ شخص (عبدالرحیم) جب سے اب تک مفقود الخبر ہے۔

اس ہدایت نامے میں شیخ عبدالرحیم سے یہ التماس کی گئی تھی کہ کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے یہ خطوط مکہ معظمہ میں محمود حسن تک پہنچا دے۔ یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے پر بہت خوش خط لکھے گئے تھے۔"

خدائی فوج کا قیام

"ان خطوط میں خدائی فوج کا بھی ذکر تھا، اس فوج کے بارے میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اس کے لیے ہندوستان میں سپاہی بھرتی کیے جائیں۔ اور مسلمان حکمرانوں کے مابین اتحاد اور دوستی اور تجارت کے جذبات پیدا کیے جائیں۔

اس فوج کا صدر دفتر مدینہ منورہ تجویز کیا گیا تھا۔ اس کا سالار اعلیٰ

محمود حسن (شیخ الہندؒ) کو بنایا گیا تھا۔ دوسرے صدر دفتر مقامی افسروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم کیے جانا تجویز ہوئے تھے، کابل میں اس فوج کی سالاری پر عبیداللہ (مولانا عبیداللہ سندھی) نامزد ہوا تھا لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جنرل، ایک کرنل اور چھ لیفٹیننٹ کرنل تجویز ہوئے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں اس خدائی فوج، عارضی حکومت اور انقلابی جماعت کے چار آدمی برطانیہ کے ہاتھ آگئے جو اس وقت نظر بند ہیں، غالب پاشا بھی جس نے فرمانِ جہاد شائع کیا تھا، آج کل ایک جنگی قیدی ہے۔ وہ اس بات کا مقر ہے کہ اس کاغذ پر اس نے دستخط کیے تھے جو محمود حسن (شیخ الہند) کی جماعت نے اس کے روبرو پیش کیا تھا۔"

اس اعلانِ جہاد میں کہا گیا تھا۔

" ایشیا، یورپ، اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کے راستے میں جہاد و قتال کے لیے میدان میں نکل آئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین کو اسلام دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو گیا ہے، پس اے مسلمانو! اس ظالم عیسائی حکومت پر حملہ کر دو۔ جس نے تمھیں بے بس کر رکھا ہے، اپنی پوری قوت دشمن کو فنا کرنے اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں صرف کر دو۔

تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ محمود حسن (شیخ الہندؒ) آفندی، جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے ہمارے پاس تشریف فرما ہیں، انھوں نے ہم سے صلاح کی، اور ہم نے ان کی رائے پر صاد کیا۔ اگر وہ (یا ان کا کوئی نمایندہ) تمھارے پاس آئیں، تو ان پر پورا اعتماد کرو۔ اور جان و مال

سے ان کی مدد کرو"

"(رولٹ کمیٹی کے) اس باب میں جو واقعات لکھے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند مسلمان مذہبی دیوانے اس ملک میں بغاوت برپا کرنے کے لیے کس درجہ مضطرب اور بے قرار تھے، اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے برطانیہ کے دشمنوں سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، جنگ اور فساد برپا کرنے کے لیے ان لوگوں کے طریقے یہ ہیں کہ پہلے خفیہ طور پر، یہ اپنی تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں۔ پھر سازشوں کا دور شروع ہوتا ہے اور پھر علی الاعلان فتنہ و فساد اور کشت و خون پر اتر آتے ہیں، وعظ، تلقین نصائح یہ ان کے حربے ہیں، ان کے مقابلے میں اگر کوئی چیز کارگر ہے تو صرف حکومت کی طاقت اور قوت کا رعب۔"

سڈنی صاحب نے یہ بات کچھ غلط بھی نہیں کہی تھی حکومت کی طاقت اور رعب کی انتہا نہیں تھی، اور رعب و طاقت کے مظاہرے صرف اندرونِ ہند میں نہیں ہوتے رہتے تھے، بلکہ بیرونِ ہند میں بھی ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کو جو حجاز مقدس میں مقیم تھے۔ شریف مکہ نے گرفتار کیا، اور برطانوی حکام کے حوالے کر دیا، جنھوں نے انھیں مالٹا بھیج دیا۔ جہاں وہ عرصے تک نظر بند رہے۔

انگریزوں کو تہس نہس کرنے کے سلسلے میں مسلمان انقلابیوں نے صرف ہندوستان ہی کی سرزمین منتخب نہیں کی تھی، بلکہ ہر خطۂ ارض پر، جو کچھ بھی ان کے بس میں تھا اور جو بس میں نہیں تھا، کرتے رہتے تھے، چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں نے جو غدر پارٹی قائم کی تھی، اس میں کافی غیر مسلم بھی شریک کر لیے تھے۔ یہ غدر پارٹی پورے پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل تھی۔ اور امریکہ، انگلستان، جرمنی اور دوسرے ممالک میں خفیہ اور زمین دوز تحریکیں چلا رہی تھی۔ اس کی ایک شاخ برما میں بھی قائم ہوئی تھی۔

اور یہاں بھی مسلمانوں نے خاصے کارنامے انجام دیے۔"

جہانِ اسلام۔ قسطنطنیہ

لالہ ہردیال ستمبر ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ تشریف لے گئے، وہاں ایک ہندوستانی مسلمان ابوسعید سے ان کی راہ ورسم پیدا ہوگئی۔ "جہانِ اسلام" کے نام سے جو انقلابی اخبار غدر کی ترغیب کے لیے نکلا تھا اس کے اردو حصے کے انچارج یہی صاحب تھے۔ حکومت ترکیہ سرکاری پیمانے پر بھی انگریزوں کے دام ہمرنگ زمین کو کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی

رنگون میں انقلابی سرگرمیاں

"ینگ ترکی پارٹی" کے ایک سرکردہ ممبر توفیق بے ۱۹۱۳ء میں رنگون آئے، اور وہاں کے ایک سوداگر ملا احمد داؤد کو جو انگریزوں کا دشمن اور ہندوستان کی سرزمین کو فرنگی نفوذ سے خالی کرا لینے کا زبردست حامی تھا، ترکیہ کا قونصل بنا دیا۔ ترکیہ نے جس وقت اعلانِ جنگ کیا اور برطانیہ کے بجائے جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس وقت بھی ہلال احمر کے دو ہندوستانی ممبر حکیم فہم علی اور علی احمد صدیقی رنگون (برما) آئے اور جنگ بلقان کے سلسلے میں ترکوں کی امداد واعانت کے لیے انھوں نے زبردست جدوجہد کی۔

بلوچ رجمنٹ کی بغاوت

رنگون کی انقلابی سرگرمیوں کے نتیجہ خیز ہونے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نومبر ۱۹۱۳ء میں بلوچ رجمنٹ بمبئی سے وہاں پہنچی، لیکن غدر پارٹی اور انقلابی پارٹیوں کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر جنوری ۱۹۱۵ء میں آمادۂ غدر ہوگئی۔ لیکن اعلیٰ حکام کو مخبروں سے اطلاع مل چکی تھی۔ انھوں نے تدارک کر لیا تھا۔ پھر بھی دو سو آدمی اس رجمنٹ کے سزایاب ہوئے۔

ملایا کی ہندوستانی فوج کی بغاوت

دسمبر ۱۹۱۴ء میں گجرات کے رہنے والے مسلمان قاسم منصور کے خط پکڑے گئے۔ جن سے معلوم ہوا کہ ملایا کی ہندوستانی فوج (جو زیادہ تر مسلمانوں پر

مشتمل تھی) انگریزوں سے لڑنے ترکوں کی تائید و حمایت میں ہتھیار اٹھانے اور اسلام کی حرمت پر جان دینے کو تیار رہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ جلد از جلد ایک جہاز سنگاپور بھیج دیا جائے۔

یہ تجویز بھی عمل میں نہ آسکی، کیونکہ انگریزوں نے مخبروں کا جال ہر چہار طرف پھیلا رکھا تھا۔ اور وہ انھیں پل پل اور رتی رتی کی خبریں پہنچایا کرتے تھے، چنانچہ ملا احمد داؤد جہاز تورنگون سے سنگاپور نہیں بھیج سکے البتہ اس فوج کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔"

مذکورہ واقعات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے انگریزوں کے ابتلا سے نجات حاصل کرنے "چنگیزی افرنگ" کا مقابلہ کرنے بیرونی اور اندرونی دشمنانِ اسلام سے بے سروسامانی اور تہی مائیگی کے باوجود عہدہ برآ ہونے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکے، اس ناکامی میں کچھ ناتجربہ کاری کو دخل تھا، کچھ نامساعد حالات کو، اور زیادہ اپنی ہی قوم اور ملک کے غداروں کو، جو چند روپوں کے لیے مخبری کر رہے تھے۔ لیکن بہرحال انھوں نے اپنی عزیمت و استقامت کا ثبوت دے دیا۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے، ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی

(۱)

ہندوستان کے علماء میں سب سے پہلے جو علمائے کرام زاویۂ خانقاہ وحلقۂ درس و افتا کو ترک کر کے فرنگی استعمار کے مقابلے میں سدِ سکندری بن کر حائل ہوئے ان میں سب سے پہلا نام قیام الملت والدین مولانا عبدالباری فرنگی محلّی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد کا آتا ہے۔ دوسرے علمائے کرام انہی مذکورہ اصحاب کی دعوت، تحریک، تلقین اور تبلیغ سے مسجد و خانقاہ سے اٹھ کر، میدان میں اترے، اور بلاشبہ عظیم اور وقیع اور عہد آفرین کارنامے انجام دیے۔ ان میں حضرت مولانا معین الدین اجمیریؒ مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، اور مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات میں سے ہر ایک کا طرزِ عمل، اندازِ کار، اور اسلوبِ جہد و ازم جداگانہ اور منفرد تھا، اور ایک مفصّل داستان اور دفتر کا طالب ہے۔

شیخ الہند کی گرفتاری

آج کی مجلس میں خاص طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس کے لیے کئی باب درکار ہوں گے ریشمی رومال کی تحریک میں جس کا ذکر گزشتہ باب میں کر چکا ہوں۔ شیخ الہند کو خاص طور پر مورد الزام قرار دیا گیا۔ حکومت کے معتوب قرار پائے۔ دیوبند سے جہاں وہ صدالمدرسین

تھے۔ وہ حجاز مقدس روانہ ہوئے، جس پر ترکوں کی حکومت تھی اور ان کی ماتحتی میں حسین شریف (گورنر) مکہ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اسے انگریزوں نے وسیع تر متحدہ عرب حکومت کا سبز باغ دکھا کر ترکوں سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اور یہ خلیفۃ المسلمین کے خلاف آمادۂ عمل ہو چکا تھا۔ اور پہلی جنگ عظیم میں تو یہ کھل کر میدان میں آ گیا تھا۔ لہٰذا حجاز مقدس، یعنی بیت اللہ اور جوار رسولؐ میں بھی مولاناؒ کو پناہ نہ مل سکی۔ طرح طرح کے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ گرفتاری عمل میں آئی، مصر بھیجے گئے، جہاں انگریز برسرِ حکومت تھے وہاں مزید اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، پھر ایک اجنبی اور دور دراز مقام مالٹا میں بھیج دیے گئے۔ اذیت رسانی میں جو اب تک کسر رہ گئی تھی، وہ یہاں پوری ہو گئی۔

مولانا جسمانی اعتبار سے کمزور اور نحیف تھے، دائم المرض تھے، کہن سال تھے، یہ ابتلا اور یہ مصائب ان کے لیے جان لیوا تھے۔ اور بالآخر انہی مصائب کے نتیجے میں ان کا وصال ہوا۔ لیکن اس ضعیفی، کمزوری، علالت، نقاہت اور کہن سالی کے باوجود مولانا کی جبینِ استقامت میں فرق اور پائے ثبات میں تزلزل نہیں پیدا ہوا، مجاہد کی یہی شان ہے۔ اور بلاشبہ مولانا مجاہد تھے۔

مولانا حسین احمد اس زمانے میں، حجاز میں مقیم تھے۔ وہ شیخ الہند کے شاگرد تھے۔ اور کوئی شبہ نہیں پوری سعادت کے ساتھ مولانا کی رفاقت اور خدمت کا انھوں نے حق ادا کر دیا۔

سفرنامۂ شیخ الہندؒ کراچی جیل میں جب علی برادران کے ساتھ مولانا حسین احمد اسیر تھے، تو وہاں انھوں نے اپنے استاد شیخ الہند کے حالات اسارت و ابتلا کو اپنی مخصوص عالمانہ زبان میں قلم بند فرمایا تھا۔ یہ تحریر (جو "اسیر مالٹا۔ سفرنامہ شیخ الہند" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔) اب کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے، جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ شیخ الہند کے حالات اور ان کی اسارت و ابتلا سے متعلق جو کچھ مولانا حسین احمد نے تحریر فرمایا تھا اسی کو سامنے رکھ کر اپنے الفاظ میں خلاصۂ احوال پیش کر رہا ہوں۔ میں نے صرف

وہی چیزیں لی ہیں جو اصل موضوع سے تعلق رکھتی ہیں، غیر متعلق مباحث کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لیے کہ میں صرف واقعات پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ جو بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی نہ کسی نہج سے تحریک پاکستان کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی اور دینی شعور و بلوغ نے کس طرح فرنگی سامراج میں انحطاط پیدا کیا، اور ہندوستان کی سب سے بڑی اکثریت یعنی ہندو قوم کو آمادۂ عمل کرنے کی نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز سعی و کوشش کی۔

سعید و مضطرب روح

بلقان اور طرابلس کے سنگین واقعات نے مولانا کو سراپا اضطراب کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا نے فتوے چھپوائے اور دیوبند کے طلبا کے وفود بھجوائے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر اچھی خاصی مقدار روپے کی بھجوائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ برطانوی ہوّے نے سکّہ جما رکھا تھا۔ اسی اثنار میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی، ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت اسلامیہ عثمانیہ کی ہمدردی گناہ شمار ہونے لگی۔ بعض مقامات میں تحفظ خلافت کے لیے دعا کرنا بھی جرم قرار پایا۔ ہر ضلع میں معزز لوگ جمع کیے گئے اور ان سے خلافت سے متعلق ان کا نقطۂ نظر دریافت کیا گیا عموماً ایمان فروشوں نے ترکیہ سے اپنی بے تعلقی اور برطانیہ سے ہر طرح ہمدردی اور وفاداری کا اظہار کیا۔ بہت سے علمائے سو نے خلافت عثمانیہ کے خلاف زہریلے فتوے شائع کرائے۔ یہ حالات دیکھ کر بسا اوقات بعض مخالف مصلحت اور مغائر سیاست کلمات مولانا کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتے تھے۔ مخبروں نے یہ بات حکومت تک پہنچائی، حکومت کی طرف سے وہ فتوے جو اس نے خلافت عثمانیہ کے عدم استحقاق خلافت پر مبنی تھے دو مرتبہ مولانا کے پاس تائیدی اور توثیقی دستخط کے لیے بھیجے گئے۔ دونوں مرتبہ مولانا نے رد کر دیے۔ حکومت بدظن ہو گئی۔ مولوی عبدالحق حقانی وغیرہ ان فتووں

کے محرر اور موجد تھے، یاغستان اور افغانستان میں مولانا کے شاگرد اور معتقد خاصی تعداد میں تھے۔ حکومت کو باور کرایا گیا کہ جو تحریکات جہاد قبائل میں ہو رہی ہیں۔ وہ سب مولانا کے اشارے سے ہو رہی ہیں۔

سفر حجاز آخر نوبت بہ ایں جا رسید کہ بعض باخبر احباب نے مولانا سے عرض کیا کہ ان دنوں زیر قانونِ تحفظ ہند حکومت لوگوں کو اسیر کر رہی ہے چنانچہ مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ، مولانا شوکت علی سکریٹری خدام کعبہ، مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار اور بعض دوسرے لوگ نظر بند ہو چکے ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان کیجیے، مولانا عرصے سے سفر حجاز کا قصد کر رہے تھے۔ چنانچہ ماہ شوال ۱۳۳۳ھ یعنی تقریباً ۱۹۱۵ء میں مولانا نے عزم سفر فرمایا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق نے سامانِ سفر مہیا کرنے میں ازراہِ عقیدت بہت زیادہ مدد دی، وہ مولانا سے پہلے بمبئی چلے گئے، اور ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کر دیا۔

مولانا کے ساتھ جو لوگ شریکِ سفر تھے، ان میں مولانا مرتضیٰ احسن چاندپوری مولانا محمد سہول بھاگل پوری، مولوی محمد میاں انبیٹھوی، مولانا عزیر گل ساکن نہارت کاکا صاحب وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ الہند حجاز میں ۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو اکبر جہاز پر سوار ہو کر مولانا بعزم حجاز جدّہ روانہ ہوئے، ۲۷ ذی قعدہ کو مولانا اونٹ کی سواری پر مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور ۲۸ کو داخل مکہ ہوئے، طواف قدوم وسعی وغیرہ سے فراغت کے بعد، اولئے عبادت میں مشغول ہو گئے۔

۲۱ ذی الحجہ بروز دوشنبہ مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ اور بخیر وعافیت پہنچ گئے۔ یہاں حکومت کے کانوں تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ مولانا نے مدتِ قیام مکہ معظمہ میں

غالب پاشا گورنر حجاز سے ملاقات کی تھی۔ لوگوں نے حکومت کے کان تک یہ بھی پہنچایا کہ مولانا نے انور پاشا اور جمال پاشا سے تحریری وثائق اور عہود حاصل کرکے مولوی ہادی حسن کے ذریعے بھیجے ہیں۔ یہ ایک اور سبب بدظنی کا ہوا۔

گورنر مدینہ منورہ کی بدظنی حج وزیارت کے بعد، مولانا نے اپنے رفقائے سفر کو ہندوستان واپس کردیا۔ خود مع اپنی اہلیہ کے نیت قیام کرلی، اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، بعض ہندوستانی لوگوں نے یہاں بھی مولانا کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اور در اندازی کرکے پولیس کمشنر فخری آفندی گورنر مدینہ بصری پاشا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ مولانا اور ان کے رفقاء حکومت برطانیہ کی سی، آئی، ڈی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں مارشل لاء نافذ تھا، اور حکم صادر کردیا گیا تھا کہ عربی اور ترکی زبان کے علاوہ حجاز میں جو خط کسی دوسری زبان میں آئے گا وہ جرم تصور کیا جائے گا، اور مولانا کے پاس طول طویل خط اردو میں ہندوستان سے آرہے تھے۔ یہ وجہ اور زیادہ بدظنی کی ہوئی، اگر مولانا کے حامی اور عقیدت مند حجاز میں نہ ہوتے تو مارشل لاء کی زد میں آکر نہ جانے ان کا کیا حشر ہوتا۔ پھر بھی عتاب اور بدگمانی کا سلسلہ ترکی حکام کی طرف سے قائم رہا۔

ترکی زعما کی مدینہ منورہ میں آمد امور جنگ کا انتظام غازی انور پاشا کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے وہ جملہ محاذوں کا دورہ کیا کرتے تھے۔ جب وہ سوریہ آئے اور سویز وغیرہ کے میدان جنگ کے معائنے سے فارغ ہوئے تو دیار رسولؐ کے شوق زیارت نے انھیں بے تاب کردیا، چنانچہ، وہ جمال پاشا ترکی وزیر بحریہ، اور دوسرے بڑے فوجی افسروں کے ساتھ اسپیشل ٹرین پر مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ انور پاشا نے مدینہ منورہ کا سفر کرتے وقت اپنا افسری کا لباس اور نشانات حربی وغیرہ اس خیال سے اتار دیے تھے کہ ایک ادنیٰ غلام

شہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں جا رہا ہے۔

ٹرین سے جس وقت دونوں وزیر مع ہمراہیوں کے اترے تو سپاسنامہ اہالیانِ شہر کی طرف سے پیش کیا گیا۔ گورنر مدینہ منورہ اور دیگر حکام نے روضۂ رسولؐ تک جانے کے لیے شان دار سواری کا انتظام کیا تھا، مگر انور پاشا نے انکار کر دیا، اور کہا:۔

"بارگاہ نبوت تک ہم پاپیادہ اس طرح جائیں گے جس طرح غلام آقا کے سامنے حاضر ہوتا ہے"!

ایک قابلِ دید جلوس

اہل شہر نے جو جلوس نکالا وہ قابل دید تھا۔ اہلِ تصوف کے جتنے مختلف حلقے مدینہ منورہ میں تھے سب کے سب علیحدہ علیحدہ مع اپنے مریدوں اور زرین جھنڈوں کے اشعار دعائیہ پڑھتے جاتے تھے۔ اس کے بعد حرمِ محترم نبویؐ کے خدام کی جماعتیں تھیں۔ حرم کے جاروب کشوں، موذنوں، اماموں اور خطیبوں کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں تھیں، حجرۂ مطہرۂ نبویہ کے خاص خدام کی جماعت جدا، یہ سب کے سب درجہ بدرجہ یکے بعد دیگرے حمد و صلوٰۃ پڑھتے اپنے رسمی لباس میں چل رہے تھے۔ ان کے بعد دونوں وزیر چل رہے تھے۔ ان کے پسِ پشت ان کے رفقاء اور دیگر حکام تھے، ان کے بعد اہلِ شہر دائیں اور بائیں ترکی فوجیوں کی زنجیریں (قطاریں) تھیں۔ مکانات کی چھتوں پر خلقت کا بے پناہ ہجوم؛ جمال پاشا اور دیگر حکام اور فوجی جرنیلوں وغیرہ کی نظریں کبھی کبھی دائیں بائیں بھی پڑ جاتی تھیں۔

مگر انور پاشا کی نظریں زمین سے لگی ہوئی تھیں، نہایت ادب اور احترام سے چل رہے تھے۔ جیسے ایک شہنشاہ والا تبار کے سامنے حاضر ہوں۔

اس طرح یہ مجمع باب السلام تک پہنچا۔

باب السلام سے یہ حضرات جب دست بستہ حرمِ نبویؐ میں داخل ہوئے اور مزوّر

نے دعائے دخول پڑھانی شروع کی تو انور پاشا کی آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں برسا رہی تھیں

روضۂ نبویؐ کا انتظام

شاہانِ روم (خلافت ترکیہ) حرمین شریفین پر تیس ہزار پونڈ ماہوار صرف کرتے تھے، شاہان روم (خلفائے عثمانیہ) نے روزانہ خدمت روضۂ اقدس اور خدمت بیت اللہ کے لیے ایک ایک خاص شخص مقرر کر رکھا تھا جس کا اصلی کام یہ تھا کہ ہر روز جاروب کشی اور روشنی قندیل چاکری کا لباس پہن کر سلطان ترکی کی طرف سے ادا کرے۔ یہ از روئے منصب شیخ الحرم کہلاتا تھا، یہ استنبول کے اونچے خاندان اور بڑے رتبے کا شخص ہوتا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی بہت زیادہ تھی۔ صبح کی نماز کے بعد اس پر لازم تھا کہ چاکری کا لباس پہن کر روضۂ مطہرہ کی جاروب کشی سلطان کی طرف سے کرے، شام کو مغرب سے کچھ پہلے داخل ہوتا اور چند قندیلیں خدام کے ساتھ اس غلامانہ لباس میں خلیفۃ المسلمین کی طرف سے روشن کرتا۔ سلطان کی طرف سے صلوٰۃ وسلام کے بعد دعا کرتا۔ اس زمانے میں شیخ الحرم سعید آفندی تھے جو باعلم، روشن دماغ اور پرہیزگار شخص تھے مولانا سے انھیں خاص ربط وتعلق تھا۔ ان کی طبیعت تصوف کی طرف بھی بہت زیادہ مائل تھی۔

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری

(۲)

عربوں اور ترکوں کے مابین پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک جو تلخ تعلقات چلے آرہے ہیں ان کا سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قبرص کے معاملے میں متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) پادری میکاریوس جیسے اسلام، اور مسلمانوں کے بدترین دشمن کی تائید کر رہی ہے۔ مگر ترکوں سے اظہار ہمدردی پہ تیار نہیں ہے، شیخ الہند کے احوال وکوائف کے سلسلے میں ضمناً ان واقعات کا طائرانہ مطالعہ بھی مفید رہے گا۔ جس سے ترکوں کی، دینداری، حبِ اسلام، عشقِ رسولؐ اور عربوں کے ساتھ حد درجہ مشفقانہ برتاؤ پر روشنی پڑتی ہے۔ گزشتہ باب میں انور پاشا وزیر جنگ ترکیہ کے دیارِ رسولؐ میں حاضر ہونے کے واقعات مختصراً بیان کیے جا چکے ہیں۔ جن سے میرا دعویٰ زیادہ واضح طور پہ ثابت ہوتا ہے۔

دوران قیام مدینہ منورہ میں، شیخ الہند کی ملاقات غازی انور پاشا اور جمال پاشا سے سرسری طور پہ ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان دونوں کو بتایا گیا کہ مولانا اور ان کے رفقاء کو پولیس شک وشبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور ایذا رسانی پہ تیار ہے تو شام پہنچ کر جمال پاشا نے ایک خاص حکم بھیجا کہ حرمین شریفین میں دول متحاربہ کی رعایا

کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو ہماری رعایا کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس حکم کے بعد پولیس کا رویہ بدل گیا۔

اہلِ مدینہ سے ترکوں کا حسنِ سلوک

غازی انور پاشا نے اہل مدینہ اور خدام حرم نبویؐ اور علماء کے لیے پانچ ہزار پونڈ دیے۔ جو تقسیم کر دیے گئے، شیخ الہند اور مولانا حسین احمد کو بھی اس میں سے حصہ ملا۔ مگر دونوں نے انکار کیا، اور کہا:۔

"ہم مستغنی ہیں ہمیں کوئی ضرورت نہیں:"

مگر کہا گیا یہ صدقہ نہیں شاہی ہدیہ ہے، اس لیے دونوں حضرات نے قبول فرمایا۔

جمال پاشا نے اہل حجاز کی حالت دیکھ کر بارہ ویگن گیہوں سے بھرے ہوئے اہالیٔ مدینہ منورہ کو تقسیم کرنے کے لیے بھیجے۔ انور پاشا نے پانچ ہزار گنی مکہ معظمہ بھی وہاں کے ضعفاء، فقراء اور مساکین پر تقسیم کے لیے بھیجے۔ یہ جنگ کا زمانہ تھا، رعایا کو دینا تو درکنار، اس سے لوٹ کھسوٹ کر چندے کے نام پر اور قرض کے نام سے اور متعدد طریقوں سے ہندوستان میں حکومت جنگی فنڈ کے لیے روپیہ وصول کرتی تھی، مگر ترکی حکومت حجاز کے فقراء کا پیٹ اپنے خزانے سے بھر رہی تھی

شریف حسین کی بغاوت

ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ کی ۱۲ یا ۱۳ تاریخ کو محمود حسن صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔

مولانا حسین احمد فرماتے ہیں:۔

"جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں، عام بدوؤں اور اہل شہر کی زبانی سنا جاتا تھا کہ عن قریب بدعملی ہونے والی ہے۔ شریف انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ اور بغاوت کرنے والا ہے، شریف حسین نے

باب عالی (مرکز خلافت) کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمے دار میں ہوں یہاں زیادہ فوج رکھنے کی ضرورت نہیں۔ محاذ جنگ پر ترکی فوجوں کا بھیجنا قرین مصلحت ہے۔ اسی زمانے میں یہ خبر بھی مشہور ہوئی کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے شریف حسین کے نام خط آیا ہے کہ فلاں تاریخ تک یا تو ترکوں کو حجاز سے نکال دو، ورنہ ہم شریف علی کو — جو پہلے شریف حجاز تھا۔ اور شریف حسین کا بہنوئی تھا، اور اس وقت مصر میں مقیم تھا — حجاز کا شریف بنا دیں گے۔"

گرمی کی شدت کے باعث شیخ الہند کچھ روز کے لیے مکہ معظمہ سے طائف آ گئے تھے۔ جو سرد مقام تھا۔ ۱۱ شعبان ۱۳۳۴ھ کو صبح صادق کے وقت ہر چہار طرف سے شریف حسین کی فوجوں نے چڑھائی کر دی۔ ترکی فوج نے بھی جو تعداد میں بہت کم تھی جواب دیا۔ اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، ینبوع اور مدینہ منورہ میں بھی یہی واقعہ پیش آ چکا تھا شریف حسین نے منصوبہ یہ بنایا تھا کہ ایک ہی دن میں ترکوں کی مختصر فوج کو ہر جگہ نشانۂ مرگ بنا دیا جائے۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی۔ افسوس کے عید کے دن بھی شریف کے سپاہیوں نے جنگ موقوف نہیں کی۔

ترکوں کے خلاف کفر کا فتویٰ

۶ شوال ۱۳۳۴ھ کو طائف سے روانہ ہو کر ۱۰ کو مولانا مکہ معظمہ آ گئے، تاکہ فریضۂ حج ادا کر لیا جائے۔ یہاں خان بہادر مبارک علی اورنگ آباد (دکن) کے موجود تھے۔ یہ سرکاری آدمی تھے۔ ترکوں کو ہر مجلس میں برا کہتے تھے۔ شریف کی حکومت کے ثنا خواں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں حکومت ہند کا فرستادہ ہوں۔ تاکہ حجاز کے احوال واقعی سے اہل ہند کو مطلع کروں، کیونکہ وہاں بہت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور لوگ برطانیہ اور شریف حسین کے خلاف ناسزا الفاظ استعمال کرتے اور سخت و شدید احتجاج

کر رہے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک اعلان علمائے مکہ کی طرف سے مجھے دیا جائے جس میں ترکوں، ان کی حکومت اور خلافت عثمانیہ کی زشت کاریاں بیان کی جائیں ان کے استحقاق خلافت کی تردید کی گئی ہو۔ موجودہ عرب بغاوت اور شریف حسین کا ذکر مدح وتحسین کے ساتھ کیا گیا ہو۔ چنانچہ اس مفہوم کا ایک محضر تیار کیا گیا، اور ان علماء سے جو شریف کے مقرب بارگاہ اور معتمد خصوصی تھے، دستخط کرا لیے گئے بہتوں نے بہ رضا و رغبت اور اکثر نے بہ جبر و اکراہ دستخط کر دیے۔ خان بہادر نے کہا علمائے مکہ کو ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا، لہٰذا مناسب ہے کہ مولانا محمود حسن دیوبندی کے دستخط بھی کرا لیے جائیں۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، نیز ہندوستان کے دوسرے علماء جو حجاز میں مقیم ہیں، ان سے بھی دستخط کرا لیے جائیں۔!

حضرت شیخ الہند کا فتوے کی تصویب سے انکار

اب حجاز پر شریف کا مکمل قبضہ تھا۔ وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج نے جو ترکوں کے زمانۂ حکومت میں مفتی احناف تھے۔ اور اب انقلاب و بغاوت کے بعد شیخ الاسلام بنا دیے گئے تھے۔ نقیب العلماء کے ذریعے یہ محضر حضرت شیخ الہند کے پاس بھیجا، ان سے مولانا حسین احمد نے مولانا کی طرف سے کہا اس پر دستخط نہیں کیے جا سکتے۔ کیونکہ اس محضر میں:۔

۱ — ترک قوم کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ اور مسلمان کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں جو احکام ہیں وہ آپ کو بھی معلوم ہیں۔

۲ — وجہ تکفیر سلطان عبدالحمید خاں کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا ہے، حالانکہ کسی فقیہہ نے اسے موجبات کفر میں سے قرار نہیں دیا ہے۔

۳ ۔ سلاطین آل عثمان کو خلیفہ ماننے سے اس محضر میں انکار کیا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ امر مخالف نصوصِ شرعیہ ہے ۔

۴ ۔ اس محضر میں عربوں کی بغاوت اور (برطانیہ کی مدد سے) فوجی انقلاب کو جائز اور مستحسن دکھایا گیا ہے ۔ حالانکہ شرعاً یہ واقعہ حد درجہ قبیح ہے ۔

۵ ۔ شیخ الہند علمائے مکہ میں سے نہیں ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں ، میں آفاقی شخص ہوں پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھے اس پر دستخط کرنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ بہرحال یہ فتویٰ اخبار "القبلہ" میں شایع کر دیا گیا ۔ اور خان بہادر مبارک علی اسے لے کر روانہ ہو گئے ۔

خیر خواہوں نے شیخ الہند سے عرض کیا کہ کہیں شریف حسین آپ کو کسی طرح کی اذیت نہ دے مولانا نے جواب دیا :-

"پھر کیا کیا جائے ، مذہبی حیثیت سے اس پر مہر اور دستخط کسی طرح جائز نہ تھا ، آیندہ جو کچھ تقدیر الہٰی میں ہو گا ، جھیلیں گے ! "

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری

اسی اثنا میں شریف حسین جدہ گیا وہاں کرنل ولسن معتمد حکومت برطانیہ سے اس کی گفتگو ہوئی شب کو شیخ الاسلام کے نام حکم آیا کہ مولانا اور ان کے جملہ ہمراہیوں کو زیر حراست یہاں بھیج دو ۔

مولانا حسین احمد کا بیان ہے :-

"صبح کو شیخ المسطوفین احمد سنجی مولانا کی قیام گاہ پر آیا ، اس نے کہا :

"تمھاری حکومت (ہند) جس کی تم رعایا ہو ، تمھیں طلب کر رہی ہے اس لیے مجھے شریف کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ تم کو روانہ کر دوں ! "

حضرت مولانا شیخ الہند کے ایک ساتھی مولانا عزیر گل صاحب نے کہا :-

"ہم یہاں کسی کافر حکومت کو نہیں جانتے ہم حرم خداوندی میں امان لیے ہوئے پڑے ہیں۔ اگر شریف ہمیں نکالتے ہیں تو ہم خوشی سے نہیں جائیں گے جب تک تم ڈنڈے کے زور سے ہمیں نہ نکالو!"

آخر یہ طے ہوا کہ کل شریف خود آجائے گا۔ اس گفتگو کے بعد جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔

شریف جب آیا تو ہمیں خبر ملی بہت برہم ہے اور ہمیں ہندوستان بھیجنے پر بضد ہے۔ رائے یہ ہوئی کہ مولانا کو اور ان کے ساتھ وحید احمد (برادر خورد مولانا حسین احمد) کو کہیں چھپا دیا جائے، اور شب کو کسی دوسری جگہ روانہ کر دیا جائے۔ باقی لوگوں کو دو چار دن شریف کی حکومت قید رکھے گی پھر چھوڑ دے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کا آدمی مجھے اور وحید احمد کو بلانے آیا، وحید موجود نہ تھا مجھے حمیدیہ میں بلا کر پولیس کمشنر نے کہا:۔

"تو انگریزی حکومت کو برا کہتا ہے اب اس کا مزا چکھ!"

پھر مجھے قید خانے میں بھیج دیا۔

پھر پولیس نے مولانا کو تلاش کیا، چونکہ وہ نہیں ملے۔ لہٰذا مولوی عزیر گل اور حکیم نصرت حسین صاحب کو پکڑا، اور کہا:۔

"جہاں سے ممکن ہو مولانا کو تلاش کرو!"

ان دونوں خدام نے لاعلمی کا اظہار کیا، باوجود سخت تقاضے اور موت کی دھمکی کے انھوں نے کوئی پتا نہیں دیا، بالآخر یہ دونوں بھی مقید رکھے گئے۔

شریف نے فرمان صادر کیا، اگر عشاء تک مولانا موجود نہ ہوئے تو ان کے دونوں ساتھیوں کو گولی مار دو، اور مسطوف کو سو کوڑے لگاؤ۔ اور مسطوفیت چھین لو، اس خبر سے مسطوف کو بہت پریشانی ہوئی، مولانا کو یہ خبر ملی تو فرمایا:۔

"میں کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا کہ میری وجہ سے کسی کو آزار پہنچایا جائے
جو کچھ ہوگا میں برداشت کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر نکلنے کو تیار ہو گئے، احباب نے کہا، احرام کے لباس میں نکلیے تاکہ لوگوں کو خیال ہو جائے یہاں تھے ہی نہیں۔ چنانچہ احرام کے لباس میں مولانا مکان پر آ گئے۔

حجاز سے روانگی

مولانا روانگی کے وقت نہایت مطمئن تھے: رخصت ہوتے وقت احباب سے فرماتے تھے۔

"الحمد للہ بہ مصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے"

مولانا کے ساتھ چند سپاہی بندوق لیے ہوئے ساتھ تھے جو نوبت بہ نوبت ہر مقام پر بدلتے رہتے تھے۔

مولانا ۲۳ر صفر شب یک شنبہ سنہ ۱۳۳۵ھ کو روانہ ہوئے اور ۲۴ر صفر کو دو شنبہ کے دن جدّہ پہنچ گئے، دوسرے روز مجھے بھی مولانا کے پاس پہنچا دیا گیا۔

۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۱۷ء مطابق ۱۸ر ربیع الاوّل سنہ ۱۳۳۵ھ کو جدّہ سے سویز کو خدیوی آگبوٹ پر ہمیں سوار کر دیا گیا۔

۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۲ر ربیع الاوّل ہمارا جہاز صبح کے وقت سویز میں لنگر انداز ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک گارڈ تقریباً اٹھارہ بیس گوروں پر مشتمل تھا، سنگینیں اور بندوقیں لیے ہوئے پہنچا اور ہم کو قریب کے کیمپ میں جو اسٹیشن کے قریب تھا، لے گیا وہاں ایک خیمے میں ہمیں ٹھہرایا گیا، اور کہا گیا کل تمھیں مصر روانہ کر دیا جائے گا۔ ہم پر ہندوستانی سپاہی پہرے کے لیے مقرر کیے گئے۔

صبح کو نماز کے وقت ہمیں ریل پر سوار کرایا گیا۔ درجہ تھرڈ کلاس تھا اور تقریباً پندرہ گورے سنگینوں سے مسلح ہمارے ساتھ تھے۔ سہ پہر کو گاڑی قاہرہ کے اسٹیشن پر پہنچی یہاں ہم اتارے گئے۔ نماز کا وقت تھا۔ وہیں نماز باجماعت پڑھی۔ گورے سپاہی ہمارے چاروں طرف سنگینیں لیے کھڑے تھے۔ عصر کے بعد موٹر پر ہمیں جیزہ پہنچا دیا گیا۔

زندانِ جیزہ سے محبسِ مالٹا تک

(۳)

جیزہ کے زندانِ سیاہ میں تفتیش

اہرام مصر جیزہ ہی میں واقع ہیں۔ یہاں پہلے زمانے میں ایک قید خانہ تھا۔ جو "زندانِ سیاہ" کے نام سے مشہور تھا، اب اسے سیاسی محبس کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے ہم یہاں داخل کیے گئے۔ ہماری تلاشی لی گئی اور جو کچھ تھا لے لیا گیا، ایک کمرے میں مولانا کو لے جایا گیا۔ اس میں تین نشستیں تین انگریزوں کی تھیں، ان میں دو انگریز بہت صاف اردو بول لیتے تھے، ایک انگریز نے پتا وغیرہ لکھنے کے بعد سوالات کیے۔

سوال :۔ آپ کو شریف مکہ نے کیوں گرفتار کیا ؟

جواب :۔ میں نے اس کے محضر پر دستخط نہیں کیے تھے۔

سوال :۔ آپ نے دستخط کیوں نہیں کیے ؟

جواب :۔ خلاف شریعت تھا۔

سوال :۔ آپ کے سامنے ترکوں کی مخالفت اور سلطنت انگلشیہ کی حمایت میں مولوی عبدالحق حقانی وغیرہ کا فتویٰ پیش کیا تھا ؟

جواب :۔ جی ہاں ۔

سوال :۔ پھر آپ نے کیا کیا ؟

جواب :۔ رد کر دیا ۔

سوال :۔ کیوں رد کیا ؟

جواب :۔ مخالف شریعت تھا ۔

سوال :۔ آپ مولوی عبید اللہ (سندھی) کو جانتے ہیں ۔؟

جواب :۔ جانتا ہوں ، انھوں نے دیوبند میں عرصۂ دراز تک مجھ سے پڑھا ہے ۔

سوال :۔ اب وہ کہاں ہیں ؟

جواب :۔ مجھے نہیں معلوم ۔

سوال :۔ ریشمی خط کی حقیقت کیا ہے ؟

جواب :۔ میں نہیں جانتا ۔

سوال :۔ وہ (مولانا عبید اللہ سندھی) لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں برطانیہ کے خلاف شریک ہیں ، اور آپ فوجی کماندار (نیشنل آرمی کے) ہیں ۔

جواب :۔ اگر وہ یہ لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمے دار ہے ، میری جسمانی حالت دیکھیے ، پھر عمر کا اندازہ کیجیے ، مجھے فنونِ حرب اور فوج کی کان سے کیا مناسبت

سوال :۔ غالب نامے کی حقیقت کیا ہے ؟

جواب :۔ غالب نامہ کیسا ؟

سوال :۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جسے آپ نے محمد میاں کے ہاتھ ہندوستان بھیجا ۔

جواب :۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے ؟

سوال :۔ کیا آپ نہیں جانتے ؟ وہ محمد میاں کے پاس ہے ، جو بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا ۔

جواب:۔ پھر آپ کو خط کا پتا کیسے چلا ؟

سوال:۔ آپ یہ بھی نہیں جانتے ؟ حالانکہ بہت سے لوگوں نے اسے دیکھا ہے ۔

جواب:۔ آپ ہی غور کیجیے ۔ غالب پاشا ٹھہرا گورنر حجاز، میں ایک معمولی آدمی، نہ میں ترکی زبان سے واقف، نہ ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط، غالب پاشا طائف میں رہتا تھا، میری وہاں تک رسائی کیوں کر ممکن تھی، یہ بالکل غیر معقول بات ہے، کسی نے یوں ہی اڑائی ہے ۔

سوال:۔ آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی ؟

جواب:۔ بے شک ۔

سوال:۔ کیوں کر ؟

جواب:۔ جب وہ مدینہ منورہ آئے تو مسجد نبویؐ میں علما کا اجتماع کیا، حسین احمد اور مفتی مکہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے ۔ اختتام اجتماع پر انھوں نے دونوں وزیروں سے میرا مصافحہ کرا دیا ۔

سوال:۔ آپ نے اس اجتماع میں کوئی تقریر کی ؟

جواب:۔ نہیں

سوال:۔ کیوں ؟!

جواب:۔ مصلحت نہ سمجھا ۔

سوال:۔ حسین احمد نے تقریر کی ؟

جواب:۔ ہاں ۔

سوال:۔ کاغذات میں مرقوم ہے کہ آپ سلطان ترکی، ایران اور افغانستان کے مابین اتحاد کرا کے اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے وہاں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں، اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کر دینے کے

مسائی ہیں ۔

جواب :۔ کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ مجھ جیسے کم نام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے ؟ اور کیا ان کی سالہا سال کی عداوتیں مجھ جیسا شخص زائل کرا سکتا ہے؛ اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو کیا ان میں اتنی قوت ہے کہ اپنے ملک کی ضرورت کو نظر انداز کر کے ہندوستان کے حدود پر اپنی فوجیں پہنچا دیں اور اگر ایسا بھی ہو جائے تو کیا ان میں آپ کی حکومت سے جنگ و پیکار برپا کرنے کی طاقت ہے ۔

سوال :۔ شریف مکہ کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں ۔

جواب :۔ وہ باغی ہے ۔

جیل کی زندگی کچھ مزید سوال وجواب کے بعد مولانا کو جیل واپس کر دیا وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں وہ بند کر دیے گئے ۔

کوٹھری میں ایک بالٹی تھی جس میں وضو، پاخانہ اور پیشاب کرنے کا حکم تھا حکومت کی طرف سے ہر قیدی کو تقریباً ڈیڑھ روپیہ ملتا تھا جس میں وہ اپنے جملہ مصارف کا متکفل تھا۔ انتظام سب اسیر خود کرتے تھے، کھانا اچھا اور لذیذ ہوتا تھا صبح ایک گھنٹے کو ٹہلنے کے لیے نکالتے تھے ۔

جیل کے حالات کے ضمن میں مولانا حسین احمد نے آگے چل کر لکھا ہے :۔

ہمارے دل میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی، حالانکہ عام طور پر ہم سب کو یقین یا ظن غالب پھانسی کا تھا مولوی عزیر گل تو اپنی کوٹھری میں رہ رہ کر اپنی گردن اور گلے کو پھانسی کے لیے ناپتے اور وہ باتے تھے ۔ تاکہ عادت ہو جائے اور پھانسی کے وقت یکبارگی سخت تکلیف نہ پیش آئے۔ اور تجربہ کرتے تھے کہ دیکھوں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے، یہ مولانا کی کرامت اور ان کا خالص تصرف روحانی تھا ورنہ کہاں ہم سب اور کہاں یہ استقلال ۔

کچھ دنوں کے بعد ہم سب کو شہر میں لے گئے اور ایک جگہ ہم سب کا فوٹو لیا گیا کیونکہ اب پاسپورٹ میں ہر ایک کا فوٹو بھی رہتا ہے۔ دوسرے دن ہمیں دوسرے محکمے میں لے گئے، جہاں ہماری تشخیصات وغیرہ لکھی گئیں۔ تمام انگلیوں اور انگوٹھوں کے نشانات لیے گئے۔ کچھ نہیں معلوم تھا آیندہ ہمارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔

مالٹا کو روانگی ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مولانا کو ایک ماہ گزر جانے کے بعد معتقل (جیل خانہ) کے برٹشی افسر اعلیٰ نے ہمیں طلب کیا اور حکم صادر کیا۔

"کل تم مالٹا بھیجے جاؤ گے تیار ہو جاؤ"

۱۶ فروری کو ہمیں قاہرہ اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ تھرڈ کلاس میں گارڈ کے سنگین پہرے میں ہم اسکندریہ آئے، بند موٹر میں بٹھا کر ہمیں گودی پہنچایا گیا۔ جہاز پر سوار ہونے کا حکم ملا۔ جہاز کے بالائی طبقے پر ایک بڑا کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں بند ہی نہیں بلکہ کیلوں سے مضبوط تختوں کے ساتھ جڑ دی گئی تھیں، دروازے پر گورے سپاہیوں کا پہرہ قائم کر دیا گیا تھا۔

ترک قیدی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بہت سے ترک فوجی افسر اور سپاہی لائے گئے۔ جو گرفتار کیے گئے تھے۔ افسروں کو سکنڈ یا فسٹ کلاس میں رکھا گیا۔ سپاہیوں کو ہمارے کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ ترکی سپاہی عموماً نیک مزاج ہوتے ہیں۔ یہ سب جب داخل ہوئے اور حضرت مولانا کو دیکھا تو نہایت احترام سے پیش آئے، یہ سب آپس میں کھیلتے، گاتے، کشتی کرتے اور دھمال بجاتے تھے، جسے دیکھنے کے لیے گورے سپاہی جمع ہو جاتے تھے انھیں دیکھ کر ترک سپاہی اور زیادہ نشاط و مسرت کا یعنی اپنی قید سے بے پروائی کا اظہار کرتے تھے۔ پھر دو تین ترک سپاہی حضرت مولانا کے پاس آئے اور کہا:۔

"بظاہر ہم آپ کی بے توقیری کرتے ہیں کہ آپ کے سامنے گاتے بجاتے ہیں، اور اچھلتے کودتے ہیں۔ مگر کیا کریں دشمن کافر کے ہاتھ میں ہم اسیر ہو گئے ہیں، اگر ہم باادب بیٹھیں تو کافر خوش ہوں گے۔ اور ہمیں رنجیدہ اور غمگین خیال کریں گے۔ اس لیے ہم اپنی حوصلہ مندی اور بے خوفی جتلانے کے لیے ناچتے گاتے ہیں۔"

مولانا نے یہ سن کر فرمایا:۔

"خوب کودو، اچھلو، گاؤ، بے خوفی اور مسرت کا اظہار کرو ہماری طرف سے کھلی اجازت ہے!"۔

اہتمام روانگی شام کو ہمارا جہاز روانہ ہوا، اس کے آگے آگے ایک جنگی جہاز کروز حفاظت کی غرض سے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کبھی کبھی دائیں بائیں چکر بھی لگا لیتا تھا، اس پر بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر جلی قلم سے تحریر تھا:۔

"اس جہاز میں زخمی اور مریض سپاہی ہیں سامان جنگ نہیں ہے!"

وجہ یہ تھی کہ جرمنی آبدوز بحر ابیض میں بھی آبدوزوں کو غرق کر رہی تھیں، خود اسکندریہ میں چند روز پہلے ایک آگ بوٹ کو غرق کر چکی تھیں۔ مگر زخمی اور مریض سپاہیوں کو ایذا پہنچانا انسانیت اور معاہدات دولیں کے خلاف تھا اس لیے ان سے تعرض نہیں کرتی تھیں۔

جہاز کے لوگ عموماً اور ہم سب خصوصاً ہر وقت موت کے لیے تیار رہتے تھے، رات دن یہی خیال رہتا تھا کہ خدا جانے کب جرمن آبدوز جہاز پر گولہ پھینک دے، بعض مقامات تو بہت زیادہ خطرے کے گزرے، مگر باایں ہمہ مولانا پر کسی قسم کی گھبراہٹ یا اضطراب کا ظہور نہ ہوا۔

ہمارا جہاز دوشنبے کی صبح کو تقریباً دس بجے ۲۱ فروری ۱۹۱۶ء مطابق ۹ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ

کو مالٹا میں لنگر انداز ہوا۔ چار بجے ہم اتارے گئے، اوّل ترکی افسر اور سپاہی اترے پھر ہمیں اترنے کا حکم ہوا، ترک افسروں نے ترک سپاہیوں کو حکم دیا کہ تم ان کا سامان اتروائو انھوں نے ہاتھوں ہاتھ ہمارا سامان اتار دیا۔

حضرت مولانا کو وہ انگریز افسر جو اتارنے کو آیا تھا کرسی پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا، ہم اور جملہ سپاہی پیدل کیمپ تک گئے، اسباب موٹر پر گیا۔ ہمیں روگیٹ کیمپ میں جہاں خیمے نصب تھے ٹھہرایا گیا۔ راستے میں اہلِ شہر اور ان کے لڑکے عورتیں ہماری اسیری پر خوشیاں مناتے۔ مذاق اڑاتے اور جھنڈ کے جھنڈ پیچھے باندھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے، کیونکہ سب کے سب عیسائی تھے۔

مالٹا کے قلعے میں داخلہ ایک بڑا قلعہ جو قدیم زمانے میں پہاڑ کھود کر بنایا گیا ہے، جس کی دیواریں نہایت مستحکم ہیں۔ اس میں علاوہ وسیع میدان کے مختلف عمارتیں بھی شاندار بنی ہوئی ہیں۔

قلعہ حقیقت میں فوج اور افسروں کے رہنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ ایام جنگ میں جب خطرناک اسیروں کے لیے نہایت محفوظ مقام کی ضرورت ہوئی تو اس کو خالی کرا لیا گیا۔ کانٹے دار تاروں کے ذریعے سے اس کے چند حصے کر لیے گئے۔ ہر حصے کا الگ الگ نام بھی رکھ دیا گیا۔

روگیٹ کیمپ قلعے کی خندق میں دروازۂ قلعہ میں واقع تھا۔ اس میں اور عرب کیمپ میں مسلمان فوجی سپاہی اور سویلین رکھے جاتے تھے۔ یہاں مختلف ضروریات زندگی سے متعلق دوکانیں بھی تھیں، جن سے قیدی حسبِ ضرورت چیزیں خرید لیا کرتے تھے۔

یہاں دو شفاخانے تھے، ایک ہسپتال میں ایک قطعہ پاگل خانے کا بھی تھا، متعدد آدمیوں نے غیر معلوم اسیری سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو پھانسی دے دی بعض نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ اور پاگل تو بہت سے ہو گئے تھے۔

روزانہ ہر کیمپ میں صبح شام اسیروں کی گنتی ہوتی تھی سب کو قطار باندھ کر کھڑا ہونا پڑتا تھا افسروں اور نہایت معزز سویلین لوگوں کی گنتی ان کی جائے قیام پر ہوتی تھی حضرت والا کی گنتی بھی ان کی قیام گاہ پر ہوتی تھی۔

ہفتے میں دو دن، یعنی پیر اور جمعرات کے روز ہر شخص کو ایک کھلا لفافہ دے دیا جاتا تھا۔ اس پر ایک سفید مصالحہ چڑھا ہوتا تھا جس کی وجہ سے کوئی خفیہ تحریر نہیں لکھی جاسکتی تھی، ان خطوں کو سنسر کے پاس بھیجا جاتا تھا، سنسر آفس میں ہر زبان کے جاننے والے لوگ موجود رہتے تھے، وہ ان خطوں کو پڑھتے تھے، اگر کوئی بات خلاف سیاست پاتے تھے تو اسے کاٹ دیتے تھے یا خط پھاڑ کر پھینک دیتے تھے، لیکن کوئی اردو داں سنسر آفس میں نہیں تھا اس لیے ہمارے خط مصر یا بمبئی میں سنسر کیے جاتے تھے،

اسیروں کے پاس جو خط آتے تھے ان کی کوئی تعداد نہیں معین کی گئی تھی انھیں بھی سنسر کیا جاتا تھا۔

یہاں قیدیوں کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی، جن میں اکثر جرمن تھے جو عموماً سویلین تھے، اور مصر و سوڈان وغیرہ سے پکڑے گئے تھے۔ کچھ فوجی بھی تھے جو افریقہ کے جنگی میدانوں سے ہاتھ آئے تھے۔ ان میں ایمڈن جہاز کے لوگ بھی تھے۔

جو اسیر عیسائی مذہب کے تھے صلیب احمر کی طرف سے ان کی ضروریات کی خبر گیری ہوتی رہتی تھی۔ ان کے ملکوں سے جو زر نقد آتا تھا، یا دوسری چیزوں کے پارسل آتے تھے وہ بھی برابر تقسیم کر دیے جاتے تھے۔

شیخ الہند کا جذبۂ ایثار

استنبول سے بھی مسلمان اسیروں کے لیے ہلال احمر نے بارہا اشرفیاں اور کتابیں بھیجیں۔ اس تقسیم میں ترک افسر کسی ملک کی خصوصیت نہیں برتا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے ہاں سے آئی ہوئی رقم، ہر مسلمان اسیر کو خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو، اور ترکی رعیت خواہ کسی مذہب کی ہو سب کو حسب مرتبہ د

حاجت دیتے رہتے تھے۔ ہم کو بھی دینا چاہا مگر حضرت مولانا نے کہا۔

"اگر ہم اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ ایسے نازک وقت میں خلافتِ اسلامیہ کی مدد کر سکیں تو یہ ہمیں کب زیبا ہے کہ اس سے مالی امداد لیں"

زندانی دارالعلوم چونکہ اسیروں کے اس عظیم مجمع میں ہر قسم اور ہر لیاقت کے اور مختلف زبانوں کے لوگ جمع تھے اور کسی کے ذمے کوئی کام نہ تھا۔ اس لیے علمی ذوق رکھنے والوں کو یہ فکر رہتی تھی کہ عمر عزیز کا یہ زمانہ بے کار نہ ضائع کریں۔ اس لیے عموماً لوگوں نے اپنے اوقات کو علوم کی تحصیل اور زبانوں کے سیکھنے میں صرف کیا۔ یہاں بڑے بڑے پروفیسر مختلف زبانوں اور فنون کے موجود تھے۔ کتابیں ہر زبان کی یا تو وہیں مل جاتی تھیں یا طلب پر مصر، انگلینڈ، جرمنی، اٹلی اور فرانس سے آجاتی تھیں۔ اس طرح یہ زندان ایک حیثیت سے اچھا خاصا دارالعلوم (یونیورسٹی) بن گیا تھا۔ ہم نے بہت کم ایسے آدمی دیکھے جنھوں نے کم از کم دو زبانیں نہ سیکھ لی ہوں۔

یہ سب اسیر اتحادیوں کے عام طور پر اور برٹش گورنمنٹ کے خاص طور پر دشمن تھے۔ علانیہ انگریزوں کو برا کہتے تھے، اگر انگریزوں کی شکست کی خبر آتی تو خوشیاں مناتے تھے، جھنڈے اڑاتے تھے۔ شور و شغب مچاتے تھے، اگر خدانخواستہ جرمنی یا ٹرکی وغیرہ کے متعلق کوئی خبر آتی تھی تو سب کے چہرے اتر جاتے تھے، اور غمگین نظر آنے لگتے تھے۔

مالٹا میں مسٹر برن کی آمد اور ان کا مشن

شیخ الہند کے رفقا سے ملاقاتیں

(۴)

حضرت مولانا شیخ الہند سے ہر قوم کے ذی علم اور مقتدر لوگ بہت زیادہ تعظیم سے پیش آتے تھے۔ عید کے ایام میں مسلمانوں کے علاوہ جرمنی اور آسٹریا وغیرہ کے مقتدر اور ذی وجاہت لوگ ملنے اور مبارک باد دینے آئے تھے، پرنس جرمنی جو قیصر جرمنی کا بھتیجا تھا اور ایمڈن جہاز میں بحریہ کے فوجی کپتان کے منصب پر فائز تھا اور تمام جرمن امیروں میں شاہی خاندان کا فرد ہونے کے باعث باعتبار مرتبے کے سب سے زیادہ اور بہت بڑی عظمت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ عید کے موقعے پر مولانا کے پاس آتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھتا اور چائے نوش کر کے چلا جاتا۔ مولانا بھی دو چار مرتبہ اس کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لے گئے۔ جب کبھی راستے میں مولانا اسے دور سے نظر پڑ جاتے تو ٹوپی اتار کر اور سر جھکا کر سلام کرتا۔

مولانا کی صداقت، للہیت اور تقویٰ و طہارت کا یہ نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے فوجی افسر باوجود انگریز ہونے اور اس بات کے سمجھنے کے کہ مولانا ہمارے مخالف ہیں، ہندوستان کی آزادی کے خواہاں اور خلافت اسلامیہ کے دوست ہیں، جب مولانا کو دیکھ لیتے تھے تو نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے۔

سحر خیزی اور تہجد گزاری

روگیٹ کیمپ اگرچہ خندق میں واقع تھا مگر غضب کی سردی پڑتی تھی، دو ڈھائی بجے شب سے سردی اس درجہ بڑھ جاتی تھی کہ نہ اٹھنے کی ہمت ہوتی تھی، نہ نیند آتی تھی، صبح کے وقت نماز کے لیے اٹھنا پڑتا تھا۔ تو نیچے سے سر نکالنا ایک عذاب الیم کا سامنا ہوتا تھا، سرد ہوا کے اس زور سے تھپیڑے لگتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا وضو کرنے کی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سردی اور ہوا سے بچاؤ ہو سکے، پانی بالٹیوں میں بھر کر رات ہی کو صبح کے وضو کے لیے رکھ لیا جاتا تھا، وہ برف سے زیادہ سرد ہو جاتا تھا۔ مالٹا کی اس سخت سردی میں بھی مولانا حسب عادت ڈیڑھ دو بجے شب کو اٹھنے کے اصول پر عامل رہے، اس وقت پیشاب سے فراغت کر کے وضو کرتے، تہجد کی نماز پڑھتے، پھر صبح تک مراقبے اور ذکر خفی میں وقت گزار دیتے اس پر طرہ یہ تھا کہ اس طرح دبے پاؤں اٹھتے، اور آہستہ سے دروازہ کھولتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی، نہ نیند میں اصلاً فرق آتا، چونکہ پیشاب کا عارضہ تھا، اس عموماً شب میں کئی کئی مرتبہ وضو کرنے کی ضرورت پیش آتی، پانی حد درجہ سرد ہوتا، مگر خدا کے فضل و کرم سے باوجود ان سب امور مخالف طبع کے کوئی تکلیف مولانا کو روگیٹ کیمپ کے قیام میں مرض اور بیماری کی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد ہمارا تبادلہ روگیٹ کیمپ سے عرب کیمپ میں بغیر ہم سے استمزاج کے کر دیا گیا۔

مسٹر برن کی آمد

آخر جنوری یا شروع فروری ۱۹۱۸ء میں ایک روز صبح کے وقت ہمیں آفس میں طلب کیا گیا۔ ہم دفتر میں کرسیوں پر بیٹھ گئے، کچھ وقفے کے بعد کمانڈر ایک بوڑھے انگریز کے ساتھ وارد ہوا۔ مولانا سے اور ہم لوگوں سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے۔

اس بوڑھے شخص نے جو انگریز تھا، اردو زبان میں گفتگو شروع کر دی اور اخلاق و

تپاک کے ساتھ مزاج پرسی کی۔ مولوی عزیز گل صاحب نے خیال کیا یہ شخص ہے اور نیا نیا ملازم ہو کر اس دفتر میں آیا ہے۔ اس نے جب خطوط اور پارسلوں وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے نہایت بے رخی کے ساتھ کہا:۔

"آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں اپنے دفتر میں خود ہی دیکھ لیجیے۔"

اس نے کہا:۔

"شاید آپ ہی عزیز گل صاحب ہیں؟"

پھر ان کے مسکن اور شہر وغیرہ کا بھی ذکر کیا، انھیں بہت تعجب ہوا اس واقفیت پر۔ بعد ازاں اس بوڑھے انگریز نے اپنا ہندوستان سے آنا بیان کیا، اور کہا:۔

"میں انگلستان جا رہا ہوں۔"

کچھ دیر کے بعد ہمیں رخصت کر دیا، اور مولوی نصرت حسین صاحب کو روک لیا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر ان سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور ان کا بیان بھی قلم بند کیا۔ اس کا بہنوئی فتح پور ہسوہ کا کلکٹر تھا، اس لیے حکیم صاحب اس کے بہنوئی سے واقف تھے، اس نے انھیں بتایا کہ:۔

"میں یوپی کے گورنر سر جیمس مسٹن کا سکریٹری ہوں، اور میرا نام برن ہے، رخصت لے کر انگلستان جا رہا ہوں۔"

ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام

شام کو مسٹر برن چیف سکریٹری یوپی گورنمنٹ نے مولانا کو طلب کیا، اور پوچھا:۔

"ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟"

مولانا نے فرمایا۔ "اس مسئلے میں علماء متفق نہیں بلکہ ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔"

مسٹر برن نے سوال کیا: "آپ کی کیا رائے ہے؟"

مولانا نے جواب دیا :-

" میرے نزدیک دونوں گروہ علماء کے برسر صواب ہیں ۔"

برن صاحب نے پوچھا :-

" یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے ؟ "

مولانا نے ارشاد فرمایا :-

" دار الحرب دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، اور درحقیقت یہ دونوں اس کے درجات ہیں، جن کے احکام جدا جدا ہیں ایک اعتبار سے ہندوستان کو دار الحرب کہہ سکتے ہیں، دوسرے اعتبار سے نہیں بھی کہہ سکتے ! "

برن صاحب نے کہا :

" ذرا تفصیل بیان کیجیے ۔"

مولانا نے فرمایا :-

" دار الحرب اس ملک کو کہتے ہیں جس میں کافروں کی حکومت ہو، اور وہ اس قدر با اقتدار ہوں کہ جو حکم چاہیں جاری کر دیں ۔

مسٹر برن نے یہ سن کر کہا :-

" یہ بات تو ہندوستان میں ہے ۔"

مولانا نے کہا :-

" ہاں اس لیے ہندوستان ضرور دار الحرب ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں "

مسٹر برن نے سوال کیا :-

" دار الحرب کے دوسرے معنی کیا ہیں ؟ یہ بھی بتائیے :- "

مولانا نے جواب دیا :-

" جس ملک میں اعلانیہ طور پر شعائر اسلام اور احکام اسلامیہ ادا کرنے

کی ممانعت کی جاتی ہو۔ یہ وہ دارالحرب ہے جہاں سے ہجرت واجب ہوجاتی ہے۔"

برن صاحب کہنے لگے :۔

"یہ بات تو ہندوستان میں نہیں ہے۔"

مولانا نے ارشاد فرمایا :۔

"جس نے ہندوستان کو دارالحرب کہنے سے احتراز کیا ہے اس نے شاید یہی پہلو مدنظر رکھا ہے۔"!

برن صاحب نے یہ سب باتیں نوٹ کرلیں۔

قیدیوں کے ساتھ ترکوں کا حسنِ سلوک

مولانا حسین احمد فرماتے ہیں کہ مسٹر برن نے میرا بیان بھی لیا۔

میں نے اسے بتایا کہ ہمیں تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑا ہے، برٹش حکومت ہمارے ساتھ حد درجہ ظالمانہ برتاؤ کر رہی ہے۔ میرے بھائی ایڈریانوپل میں نظربند ہیں مگر انھیں چھ پونڈ ماہوار ترکی حکومت دے رہی ہے، انھیں قلعے میں رکھا گیا ہے۔ دن بھر تمام شہر اور ملحقات شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہے۔ فقط شہر سے دوسری جگہ جانے کی اجازت نہیں اور جب سے ان کے اہل وعیال ان کے پاس آگئے ہیں ہر عورت اور بچے کی بھی اسی حساب سے تنخواہ مقرر کردی گئی ہے،

برن صاحب نے کہا :۔

"میں ان باتوں کو تسلیم نہیں کرسکتا!"

میں نے بھائی صاحب کا خط جو ابھی حال میں ایڈریانوپل سے آیا تھا جیب سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔

برن صاحب نے فرمایا :۔

"میں عربی نہیں جانتا، یہ خط کیسے پڑھ سکتا ہوں؟ اور یقیناً آپ کے بھائی نے اپنے افسر کے حکم سے یہ لکھ دیا ہوگا"

پھر کہنے لگے :۔

"ترکوں کے پاس خود تو کھانے کو ہے نہیں دوسروں کو کیا دیں گے ہمارے بہت سے آدمی وہاں مر گئے :۔

میں نے کہا :۔

"آپ کو غلط اطلاعات ملی ہیں۔ ٹائمز میں انگریز اسیروں کے حالات شائع ہو رہے ہیں وہ نہایت تشکر اور ممنونیت کا اظہار ترکی حکومت کے حسن سلوک پر کر رہے ہیں۔ وہاں سیاسی قیدی تو درکنار جنگی قیدی بھی کانٹے دار تاروں میں قید کیے نہیں رکھے گئے ہیں"

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ترکی میں جنگی قیدیوں کو جو آزادی حاصل تھی انگریز حکومت نے اس کا نصف بھی نہیں کیا۔

ابتدائے جنگ میں برطانیہ نے ترکی اسیروں کے ساتھ جو عراق وغیرہ میں پکڑے گئے تھے نہایت برا سلوک کیا، افسروں اور بڑے رتبے والوں کے ساتھ معمولی قیدیوں، اور مجرموں کا سا برتاؤ کیا گیا، مگر جب درۂ دانیال وغیرہ میں شکستیں ہوئیں۔ اور ان کے سپاہی اور افسر بھی پکڑے گئے تب کچھ ہوش آیا، اور حقوق اسارت کا خیال ہوا۔

بعض انگریز قیدی جو انگلستان کے رہنے والے تھے وہ چھوٹنے کے بعد مالٹا ہوتے ہوئے، اپنے وطن گئے تھے، اور اپنے بعض دوستوں سے ملنے ہماری اسارت گاہ میں آئے تھے۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے انگریز قیدیوں کے ساتھ ترکوں کے حسن سلوک اور شریفانہ برتاؤ کا ذکر تشکر اور استحسان کے ساتھ کیا،

برن مشن کی ناکامی

۵

مولانا عزیر گل سے سوال و جواب

یوپی کے چیف سکریٹری مسٹر برن نے اپنے دوران قیام مالٹا میں جب وہ انگلستان جاتے ہوئے حکومت ہند کے ایماء پر چند روز کے لیے یہاں رک گئے تھے۔ مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد اور دوسرے لوگوں سے بیانات لینے، ان کے تاثرات معلوم کرنے، انھیں ٹٹولنے کے بعد صوبہ سرحد کے رہنے والے۔ اور شیخ الہند کے جاں نثار اور فدائی مولوی عزیر گل کو بھی اپنے حضور میں طلب فرمایا پہلے تو ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر سوال کیا۔

"جہاد کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

مولوی عزیر گل صاحب نے جواب دیا:۔

"آپ مجھے مسلمان خیال کرتے ہیں یا نہیں؟"

برن صاحب نے کہا:۔

"کیوں نہیں خیال کرتا!"

پھر مولوی عزیر گل صاحب نے مسٹر برن سے ایک سوال کر ڈالا:۔

"کیا کوئی شخص قرآن کی تصدیق کیے بغیر، اور اس کے تمام معنوں کے بغیر مانے ہوئے بھی مسلمان ہو سکتا ہے؟"

برن صاحب اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے:۔

"نہیں"

مولوی عزیز گل نے یہ جواب سن کر کہا:۔

"پھر اس کا کیا مطلب کہ آپ مجھ سے ایسی بات دریافت کر رہے ہیں جسے آپ بھی جانتے ہیں کہ قرآن میں مذکور ہے،!"

حکیم نصرت حسین کو رہائی کی پیش کش

سب کے آخر میں، مسٹر برن نے شیخ الہند کے عقیدت کیش، خادم اور فدائی حکیم نصرت حسین کو اپنے پاس بلایا، ان سے بھی پہلے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، پھر فرمایا:۔

"آپ کو تو میں کسی طرح بھی ملزم نہیں پاتا، میں آپ کو رہا کر دینے پر تیار ہوں، آپ ابھی اور اسی وقت ہندوستان جا سکتے ہیں!"

حکیم صاحب نے صرف اپنی ذات کے لیے یہ پیش کش مسترد کر دی اور کہا:۔

"یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ صرف مجھے نہیں، ہم سب کو رہائی عطا کریں!"

برن صاحب نے جواب دیا:۔

"یہ میرے بس میں نہیں، البتہ میں آپ کو رہا کر سکتا ہوں!"

حکیم صاحب نے اپنی رہائی کی پیش کش مسترد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"یہ نہیں ہو سکتا اگر مولانا کو یہاں چھوڑ کر میں نے آزادی قبول کر لی تو ہندوستان کے تمام مسلمان مجھے ذلیل اور حقیر خیال کریں گے۔ اور مجھے الزام دیں گے کہ مولانا کو پھنسوا کر خود رہائی حاصل کر لی۔ لہٰذا میں کسی قیمت پر بھی تنہا اپنی رہائی منظور نہیں کر سکتا۔"

برن صاحب کے پاس سے واپس آکر انھوں نے یہ سارا واقعہ بیان کیا، مولانا نے فرمایا:۔

"آپ رہائی قبول کر لیجیے، وہاں جا کر آپ ہماری خلاصی کے لیے بھی کوشش کر سکتے ہیں یہاں تو آپ بھی اتنے ہی بے بس ہیں، جتنے ہم سب،!"

مگر حکیم صاحب اپنی بات پر اڑے رہے اور ذاتی رہائی گوارا نہیں کی، حکیم صاحب دو مرتبہ اس سے پہلے بیمار ہو چکے تھے جب تیسری مرتبہ بیمار ہوئے تو شیخ الہند نے پھر انھیں ترغیب رہائی دی، اور فرمایا:

"مبادا کہ آپ رہائی کے لیے درخواست دے دو، !"

لیکن حکیم صاحب نہ مانے انھوں نے جواب دیا:۔

"زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، میں آپ سے جدائی گوارا نہیں کر سکتا، !"

شیخ الہند سے آخری ملاقات

انگلستان روانہ ہونے سے پہلے مسٹر برن مولانا کے کمرے میں آئے، ادب اور تپاک کے ساتھ معانقہ کیا اس وقت مولانا ترجمہ قرآن لکھنے میں مشغول تھے، اسے دیکھا، میز پر جتنی کتابیں رکھی ہوئی تھیں ایک نظر ان پر ڈالی۔ پھر مصافحہ کر کے چلا گیا، فارسی اچھی جانتا تھا گراں گوش تھا۔ باتیں کان میں نلکی لگا کر سنتا تھا، یا جب زور سے بات کہی جاتے تب سنتا تھا۔

مسٹر برن کی خصوصی ہدایت

دوسرے روز کمانڈر نے مولانا کو مع رفقاء کے بلایا اور کہا:۔

"مسٹر برن نے آپ کے حق میں ہمیں خاص طور سے فہمائش کی ہے، اب آپ کو رسد نہیں ملے گی، نقد ملا کرے گا، دوسری رعایتیں بھی ملحوظ رکھی جائیں گی، آپ جب کوئی ضرورت محسوس کریں ہمیں اطلاع دیں، !"

اس گفتگو کے مطابق ۲۰ رفروری ۱۹۱۷ء سے ہمیں نقد ملنے لگا، جس سے آسانی ہو گئی، اب فی کس دو شلنگ یومیہ اور مولانا کو چار شلنگ روزانہ ملنے لگے ایک شلنگ کی قیمت بارہ آنے ہوتی تھی،

حکیم نصرت حسین کی بیماری

مالٹا کے عہد اسارت کا سب سے زیادہ الم ناک واقعہ حکیم نصرت حسین کا انتقال ہے۔

حکیم صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب کے ساتھ دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ اسی زمانے میں مولانا

سے بیعت بھی ہوئے تھے، والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، مگر جب تحصیل علم کے بعد گئے تو زمینداروں کے انتظامات اور مطب میں مشغول رہتے تھے۔

رجب ۱۳۳۶ھ میں انھیں تپ دلرز ۵ کے دورے شروع ہوئے، خیال کیا گیا۔ حسب سابق معمولی شکایت ہے، انھوں نے کوئی فکر کی نہ دوسرے لوگوں نے، شعبان بھر یہی کیفیت رہی، رمضان میں انھوں نے روزے بھی رکھے، آخر رمضان میں ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا گیا، ڈاکٹر نے مختلف دوائیں استعمال کرائیں، یہ دوائیں روزے کے باعث دن کے بجائے شب میں استعمال کرتے تھے، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ہسپتال میں داخلہ عید کے بعد ڈاکٹر نے پھر معائنہ کیا، اور رائے دی کہ انھیں ہسپتال جانا چاہیے، چنانچہ ہسپتال میں داخل کر دیے گئے، رفقاء میں سے التجا اور اصرار کے باوجود کسی کو ساتھ رہنے کی اجازت نہیں ملی، بڑی مشکل اور تگ و دو کے بعد ہر تیسرے دن کچھ دیر کے لیے ملنے کی اجازت ملی۔

ہسپتال میں خصوصی توجہ مولانا حسین احمد صاحب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:۔

"پانچ چھ دن کے بعد ہم گئے۔ مگر حکیم صاحب کی حالت بہت گری ہوئی پائی، وہ بے حد کمزور اور نحیف نظر آرہے تھے۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں کا ایک بورڈ ان کے علاج میں مصروف ہے اور بہت توجہ سے علاج کیا جارہا ہے۔ نرس خاص طور پر بہت مہربانی کا برتاؤ ان کے ساتھ کرتی تھی۔ کیوں کہ یہ انگریزی میں اچھی طرح بات چیت کر لیتے تھے، برٹش رعیت ہونے کے سبب بھی رعایت کرتی تھی کیونکہ اس پورے وارڈ میں جتنے مریض تھے، سب غیر ممالک کے لوگ تھے۔

نرس نے حکیم صاحب سے کہا:۔

"میں تمھیں یخنی اور دوسری مقوی دوائیں جن میں شراب کا جوہر پڑتا ہے، دینا چاہتی ہوں، جس سے تمھاری صحت بہت جلد بحال ہو جائے گی"۔

مگر حکیم صاحب نے انکار کر دیا، اور فرمایا:۔

"ہمارے مذہب میں یہ چیزیں حلال نہیں ہیں"

نرس کف افسوس مل کر رہ گئی۔

پھر ہمیں دفتر سے ہدایت موصول ہوئی کہ ہم مرغ ذبح کر کے اس کی یخنی بھیج دیا کریں۔ چنانچہ ہم نے اس کا انتظام کر دیا۔ اور روزانہ یخنی تیار کر کے بھیجتے رہے۔ ہمیں کبھی صحت کی امید پیدا ہو جاتی تھی، کبھی یاس گھیر لیتی تھی۔

انتقال پر ملال آخر شوال میں حکیم صاحب کی حالت زیادہ خراب ہو گئی، اور ۹ ذی قعدہ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

وفات سے تقریباً دو روز پہلے حسب معمول ہم ان کی مزاج پرسی کو گئے۔ ان ایام میں انھیں سانس بہت زور زور سے آیا کرتا تھا، اور بہت جلد جلد ہوا کے لیے برقی پنکھا ان کے آگے رکھا رہتا تھا۔ وہ اکثر تکیوں کے سہارے پر کمر لگائے بیٹھے رہا کرتے تھے۔

وفات سے ایک دن پہلے جب ہم گئے تو آواز بہت پست پائی، مگر وہ خود مطمئن تھے، کسی قسم کی گھبراہٹ انھیں نہیں تھی۔ ان کا رخ قبلہ کی طرف اس وجہ سے کر دیا گیا تھا کہ ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اس لیے نماز چارپائی پر اشاروں سے پڑھنا پڑتی تھی وقت رخصت انھوں نے فرمایا:

"میرا ذکر جاری ہے، اور تعلق خداوند ذوالجلال سے بندھا ہوا ہے!"

چونکہ مرحوم کا مرض نمونیہ تجویز کیا گیا تھا، اور وہ امراض متعدی میں سے ہے۔ اس لیے اسیروں کے کمانڈار نے مولانا کو اور ہمیں طلب کر کے کہا:

"حکیم صاحب کی نعش تم کو قبرستان میں ملے گی۔ تم فقط دور سے نماز پڑھ لینا۔ تابوت کے پاس بھی نہ جانا!"

ہم نے اصرار کیا:

"ہمیں غسل دینا اور کفن پہنانا ضروری ہے۔"

اس نے جواب دیا: "ڈاکٹر کا حکم ہے کہ نعش کے پاس کوئی بھی نہ جائے۔"

ہم نے کہا:

"یہ ہماری شریعت کا حکم ہے!"

غرض اس بارے میں مولانا سے اور کمانڈار سے بہت زیادہ ردّ و قدح کی اور کسی طرح

راضی نہ ہوا تو ہم نے کہا:۔

"اچھا ہم غسل نہیں دیں گے کفن تو پہنا دیں"

جب وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا تو مولانا خفا ہو کر کہنے لگے:۔

"جب آپ ہماری مذہبی باتوں کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے تو پھر ہمیں بلایا کیوں تھا، خود ہی جو چاہے کر لیتے"

یہ کہا اور لوٹ جانے کو آمادہ ہوئے اس وقت اس نے اجازت دی۔

میت کو تیمم کرایا گیا

مولانا نے فرمایا:۔

"اس بہانے سے ہم میت کو تیمم کرا دیں گے اور کفنا بھی دیں گے!"

آخر تیمم کرا کے حکیم صاحب کی نعش کفنائی گئی، پھر مولانا نے با دل غمگین، نماز پڑھائی، دروازۂ قبرستان کے قریب ہی قبر کھدی ہوئی تیار تھی۔ اس میں دفن کر دیئے گئے۔ اس سلسلے میں جو مصارف ہوئے وہ ہم نے اپنے پاس سے ادا کیے۔ مگر سواریوں کا کرایہ کرنل اشرف بے نے جو کئی پونڈ تھا اپنے پاس سے بغیر ہماری اطلاع کے دے دیا۔

حکیم صاحب مرحوم اپنے مرض الموت میں اپنے گھر کو اکثر یاد کیا کرتے تھے، چونکہ ضعیف العمر والدۂ جوان بیوی، و کم سن بچے، اور دیگر رشتے دار تھے۔ اس لیے طبعی رغبت ضروری تھی، پھر اسارت اور سفر میں دوسرے لوگ گھر والوں کی سی خدمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اسیروں کی رہائی کا آغاز

حکیم صاحب کی وفات کے دو تین مہینے کے بعد سے اسیروں کا چھوڑا جانا شروع ہوا۔ سب سے پہلے جرمن چھوڑے گئے، پھر اہل آسٹریا کی باری آئی، بعد میں بلغاریہ کے لوگ رہا ہوئے۔ ترکی اور شامی اسیر ابھی نہیں چھوڑے گئے تھے۔ جو لوگ التوائے جنگ کے بعد استنبول سے پکڑے گئے تھے ان کو اسارت گاہ سے بہت دور رکھا گیا تھا۔ اور پرانے قیدیوں سے انھیں ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ انھی میں شیخ الاسلام خیری آفندی، اور احمد پاشا، جو غازی انور پاشا کے والد تھے اور دوسرے ترک اکابر اور منصب دار وغیرہ شامل تھے، لیکن اب انھیں بھی ہمارے کیمپ میں لے آیا گیا تھا۔ بعد شیخ الاسلام خیری آفندی کا کمرہ ہمارے کمرے سے قریب تھا۔

تقریباً پانچ یا چھ ماہ اسیروں کو یہاں سے رخصت ہوتے گزر چکے تھے، مگر ہماری نسبت

کوئی خبر اب تک نہیں آئی تھی۔

سعید حلیم پاشا سابق صدر اعظم ترکی، اور ان کے بھائی عباس حلیم پاشا سابق گورنر جنرل محمود پاشا وغیرہ اکابر ترکی سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔

مالٹا سے روانگی ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن تقریباً دس بجے ہم اگبوٹ پر سوار کر دیئے گئے۔ ہمیں سیکنڈ کلاس کے کمرے دیئے گئے اور چونکہ جہاز جنگی تھا، اس لیے اس میں کام کرنے والے صوبہ فرنٹیئر (سرحد) کے لوگ تھے، ہمارے کھانے کا انتظام انھی کے سپرد کیا گیا۔ چونکہ مولوی عزیر گل صاحب اس صوبے کے پیر ہیں ان سے ان لوگوں کی جب پشتو میں بات چیت ہوئی تو یہ لوگ ان کے شیدا ہو گئے۔ مگر ان کے افسروں کی سخت تاکید تھی کہ ان میں سے کوئی ہمارے پاس نہ بیٹھے۔

اسکندریہ میں آمد ۲۵ جمادی الثانی مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء کو صبح کے وقت ہمارا جہاز اسکندریہ پہنچا۔ سیدی بشر میں جو زندان تھا، وہاں ہمیں پیدل بھجوا دیا گیا۔ جگہ نہایت دور تھی۔ چلتے چلتے ہم پریشان ہو گئے۔ چونکہ عرصہ دراز سے قید میں تھے اس لیے پیدل چلنے کی عادت چھوٹ گئی تھی۔ مولانا کو اور زیادہ مشکل تھی، دوپہر کو ایک بجے ہم کیمپ میں پہنچے، جس میں نئے اسیروں کا قرنطینہ ہوا کرتا تھا۔ یہاں کے (قیدی) ترکی افسر ہم پر نہایت شفقت کرتے تھے، اور بہت زیادہ لطف و محبت سے پیش آتے تھے، یہ اکثر ہمارے پاس ہدایہ وغیرہ بھیجا کرتے تھے، کھانا بھی اپنے ہاں سے پکوا کر بھیج دیا کرتے تھے۔

ہندوستان واپسی اور رہائی ۵ رمضان مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء کو سوئز سے ہماری روانگی عمل میں آئی، ۲۰ رمضان المبارک پیر کے دن بمبئی پہنچ گئے۔

بمبئی میں آزاد کر دیے گئے۔

مولوی رحیم بخش نے مولانا کو مشورہ دیا کہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں حصہ نہ لیں۔ مگر یہ مشورہ قبول نہ ہوا، خلافت کمیٹی نے شاندار استقبال کیا خلافت ہاؤس ہی میں قیام فرمایا، یہیں دعوتیں ہوئیں اور ایڈریس پیش کیا گیا۔

۲۴ رمضان کو روانہ ہو کر ۲۵ کی صبح کو ہفتے کے دن دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ اتوار کی شب کو وہاں سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان کو ۹ بجے صبح دیوبند پہنچ گئے یہاں استقبال کرنے والوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔